قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا سترواں سال

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

اکتوبر 2020ء

"لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ" (الحدیث) حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

اس شمارے میں:

قرآنی نظام کیسے قائم ہوگا؟ (صفحہ نمبر:4)

پیغام برانقلاب ﷺ (صفحہ نمبر:11)

فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ (2:73) (صفحہ نمبر:23)

قرآن انسانوں کو قانون سازی کی اجازت نہیں دیتا (صفحہ نمبر:35)

اللہ کا مخلوق کے بطورِ خالق کُل مقتدرِ مطلق کا تصور (صفحہ نمبر:47)

محمد اکرم راٹھور صاحب کی وفات پر تعزیت نامے (صفحہ نمبر:55)

دُرِ کمیاب (صفحہ نمبر:60)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پرویز صاحب کے علمی اسلوب تحقیق کی تائید

قرآنی نظریات کی روشنی میں مغرب کے غلط تصورات کی تردید میں محترم پرویز اور ہمارے ہاں کے مفکرین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ان میں سے ڈاکٹر علامہ اقبال، ڈاکٹر رفیع الدین احمد اور ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی تصنیفات سے چند اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں۔ جب بھی قارئین ان اقتباسات کی روشنی میں محترم پرویز صاحب کی تصنیفات کا جائزہ لیں گے تو وہ ان تمام خوبیوں کو بشمول دیگر خوبیوں کے ان میں پائیں گے۔ اس موضوع پر محترم پرویز صاحب کا موقف جاننے کے لئے خصوصی طور پر ان کی تصانیف ''انسان نے کیا سوچا'' اور ''اسلام کیا ہے'' ملاحظہ فرمائی جا سکتی ہیں۔

(1) ڈاکٹر علامہ اقبالؒ کا موقف:

1- عقل اور وحی میں تصادم نہیں بلکہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

2- قرآن سے راہنمائی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ:

(الف) اپنے زمانوں کے تقاضوں اور اپنے دور کی فکری کاوشوں سے متعارف ہوں۔

(ب) قرآن کریم کو عربی زبان اور تصریفِ آیات کی رو سے سمجھنا چاہئے اور اس پر خارجی عناصر کو اثر انداز نہیں ہونے دینا چاہئے۔

(2) ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا موقف:

مغرب کے غلط فلسفیانہ تصورات کی تردید قرآنی نظریات سے کرتے ہوئے مصنف کے لئے ضروری ہے کہ:

1- وہ روحِ قرآن کے ساتھ پوری پوری واقفیت پیدا کریں جس کے بغیر قرآنی اور غیر قرآنی تصورات میں تمیز کرنا مشکل ہوگا۔

2- وہ مغرب کے غلط تصورات کے اصل ماخذ اور ان کے متبعین کے طرزِ خیال و عمل سے پوری پوری واقفیت پیدا کریں۔

3- وہ علم کے تمام شعبوں سے یعنی مادی، حیاتیاتی اور نفسیاتی علوم اور فلسفہ سے جو ان علوم کو جمع کر کے ایک مکمل نظریہ کائنات ترتیب دیتا ہے، اس حد تک واقف ہوں کہ ان کی ساری وسعت میں جہاں کہیں کوئی اسلامی تصور موجود ہو اسے پہچان کر لے سکیں اور استخراج اور استنباط سے مزید صحیح اسلامی تصورات کو اخذ کر سکیں۔

بقیہ صفحہ نمبر 66 پر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

اکتوبر2020ء

جلد 73 | شمارہ نمبر 10

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: قرآنی نظام کیسے قائم ہوگا؟	ادارہ	4
پیغام برانقلاب ﷺ	پرویزؒ	11
فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ (2:73)	شیخ اللہ دتاؔ، لاہور	23
قرآن انسانوں کو قانون سازی کی اجازت نہیں دیتا	خواجہ ازہر عباس، کراچی	35
اللہ کا مخلوق کے بطورِ خالق کُل مقتدرِ مطلق کا تصور	ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد	47
محمد اکرم راٹھور صاحب کی وفات پر تعزیت نامے	ادارہ	55
دُرِ کمیاب	امجد محمود، راولپنڈی	60

قائم مقام چیئرمین: خورشید انور

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر منظور الحق

خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِ تعاون: 50 روپے فی پرچہ

پاکستان: 600 روپے سالانہ

رجسٹرڈ ڈاک: 1000 روپے سالانہ

بیرونِ ملک: 2500 روپے سالانہ

رجسٹرڈ ڈاک: 5000 روپے سالانہ

ENGLISH SECTION

Surah *Al-'Hujraat* الحجرات Durus-al-Qur'an: Chapter 4 62

By G. A. Parwez (Translated by: Mansoor Alam)

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)

Phone: 042-35714546

Cell: 0321-4460787

idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam

National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore

For Domestic Transactions

Bank A/C No: 0465004073177672

For International Transactions

IBAN:PK36NBPA0465004073177672

Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ناشر: محمد اکرم راٹھور اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

عقابی شان سے جھپٹے تھے جو، بے بال و پر نکلے
ستارے شام کے خونِ شفق میں ڈوب کر نکلے

ہوئے مدفونِ دریا زیر دریا تیرنے والے
طمانچے موج کے کھاتے تھے جو، بن کر گہر نکلے

غبارِ رہ گزر ہیں، کیمیا پر ناز تھا جن کو
جبینیں خاک پر رکھتے تھے جو، اکسیر گر نکلے

ہمارا نرم رو قاصد پیامِ زندگی لایا
خبر دیتی تھیں جن کو بجلیاں وہ بے خبر نکلے

حرم رسوا ہوا پیر حرم کی کم نگاہی سے
جوانانِ تتاری کس قدر صاحب نظر نکلے

زمیں سے نوریانِ آسماں پرواز کہتے تھے
یہ خاکی زندہ تر، پائندہ تر، تابندہ تر نکلے

جہاں میں اہل ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے، اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیر ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گر تقدیر ملت ہے

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

(ماخوذ)

قرآنی نظام کیسے قائم ہوگا؟

طلوع اسلام میں۔۔قرآن کی رو سے ذاتی ملکیت' کے موضوع پر بصیرت افروز اور حقائق پرور مقالات شائع ہوتے رہے ہیں' اس کے متعلق ہمیں بہت سے استفسارات موصول ہوئے ہیں۔ان میں بہ ہیئت مجموعی جو سوال سامنے لایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اس قسم کا قرآنی نظام معیشت' جس میں ذاتی ملکیت باقی نہیں رہتی' بحالات موجودہ عمل میں کیسے لایا جاسکے گا؟ سوال بڑا اہم ہے۔اس لئے' اسی نسبت سے گہری توجہ کا مستحق۔

سب سے پہلے اس حقیقت کو سمجھ لینا چاہئے کہ اسلام کا سیاسی نظام ہو یا معاشی' معاشرتی ہو یا عدالتی ان میں سے کوئی بھی اپنی جداگانہ حیثیت نہیں رکھتا۔اسلام' انسانی زندگی کو ایک ناقابل تقسیم وحدت قرار دیتا ہے۔اور چونکہ اس کا (یعنی اسلام کا) تعلق انسانی زندگی سے ہے' اس لئے اس کا نظام بھی ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے جس کے مختلف شعبوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ پانی' ہائیڈروجن اور آکسیجن کے مرکب ہی کا نام ہوتا ہے لیکن یہ نہیں ہوسکتا کہ آپ ہائیڈروجن کو الگ سلنڈر میں بھر لیں اور اسے ایک حصہ پانی قرار دے لیں اور آکسیجن کو دوسرے سیلنڈر میں بھر کر اسے دو حصے پانی کہہ دیں۔ جب تک آپ ان دونوں کو ان کی خاص نسبت اور خاص قاعدہ کے مطابق یکجا نہیں کریں گے اسے پانی نہیں کہا جاسکے گا۔یہی کیفیت اسلامی نظام کی ہے۔اس کے الگ الگ حصے کر کے' انہیں اسلامی نظام سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔انسان' نہ تو اس کے سر کا نام ہے' نہ دل کا' نہ جگر کا نہ پھیپھڑوں کا۔حتیٰ کہ نہ خون کا نہ سانس کا۔انسان' بتمامہ انسان ہے' اور یہ تمام اجزاء انسانی زندگی کے اسباب و ذرائع ہیں۔یہی کیفیت اسلامی نظام حیات کی ہے جس کے حصے بخرے نہیں کئے جاسکتے۔ یہ ہماری حقیقت فراموشی اور کوتاہ نگہی ہے کہ نظام زندگی خواہ کسی قسم کا ہو' ہم نماز پڑھ کر سمجھ لیتے ہیں کہ ہم نے اسلام کے ایک حصہ پر عمل کرلیا اور زکوٰۃ دے کر مطمئن ہوجاتے ہیں کہ اس کے دوسرے حصے پر عمل پیرا ہوگئے۔ یہ اسلامی نظام حیات کے ارکان ہیں اور اس نظام کی عدم موجودگی میں ان کی حیثیت ایسی ہی ہے جیسے مردہ کے جسم کے اعضاء و جوارح۔

یہ جو ہمارے ہاں آئے دن مطالبہ ہوتا رہتا ہے کہ مختلف جرائم کی شرعی سزائیں دینی چاہئیں تاکہ یہاں اسلامی نظام رائج ہوجائے' تو یہ بھی اسلامی نظام کی حقیقت و ماہیت سے بے خبری کی دلیل ہے۔ قرآن کا معاشری نظام کوئی ایسا خود مکتفی عنصر نہیں کہ اسے رائج کرنے سے ہم یہ سمجھ لیں کہ یہاں اسلامی نظام رائج ہوگیا ہے' یا اسے اسلام کے مجموعی نظام سے الگ کر کے نافذ کیا جاسکے۔

یہ غلط نگہی ہمارے قدامت پسند' مذہبی طبقہ تک ہی محدود نہیں جو لوگ اپنے آپ کو کمیونسٹ کہتے ہیں' ان کے ذہن میں بھی یہی ہے کہ کمیونزم ایک معاشی نظام ہے اور بس۔ اگر وسائل پیداوار کو انفرادی ملکیت سے نکال کر' اجتماعی ملکیت میں دے دیا جائے تو اسے کمیونزم کہا جائے گا۔ یہ بھی یکسر غلط ہے اور کمیونزم کی اصل وحقیقت سے بے خبری کی دلیل۔ کمیونزم ایک فلسفۂ زندگی۔۔ ایک منفرد آئیڈیالوجی۔۔ ہے۔ اور اس آئیڈیالوجی کی بنیادوں پر ایک معاشی نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے جس کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں وسائل پیداوار انفرادی ملکیت میں نہیں رہتے۔ اگر اس معاشی نظام کو اس آئیڈیالوجی سے الگ کر دیا جائے' تو اسے کمیونزم نہیں کہا جائے گا۔

ضمناً' اس سے یہ بھی واضح ہے کہ محض اس قدر مشترک ہونے کی بنا پر کہ اسلام کے معاشی نظام میں بھی وسائل پیداوار پر ذاتی ملکیت نہیں رہتی اور یہی صورت کمیونزم میں ہوتی ہے' اسلام اور کمیونزم ایک نہیں ہوجاتے۔ اسلام کا فلسفۂ حیات' اور کمیونزم کا فلسفۂ حیات ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ بہرحال' ہم کہہ یہ رہے تھے کہ قرآن کا معاشی نظام کوئی ایسا خود مکتفی شعبہ نہیں جسے اسلام کے پورے نظام سے الگ کر کے نافذ کیا جاسکے۔ جب کسی معاشرہ میں قرآنی نظام زندگی نافذ ہوگا تو اس کا لازمی نتیجہ وہ معاشی نظام ہوگا جس میں وسائل پیداوار پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوگی۔

لہٰذا' اصل سوال یہ ہے کہ جن حالات میں سے ہم گزر رہے ہیں (یا ہمارے معاشرہ کی جو موجودہ حالت ہے') اس میں قرآنی نظام زندگی کس طرح نافذ کیا جاسکتا ہے؟

جب نبی اکرم ﷺ نے دنیا کے سامنے اسلامی نظام کو پیش کیا' تو اس وقت دنیا میں ایک بھی مسلمان نہیں تھا۔۔۔ اس وقت صورت یہ تھی کہ اس نظام کو لوگوں کے سامنے پیش کیا جاتا۔ جو شخص' دل اور دماغ کے پورے اطمینان کے بعد' اسے اپنے لئے قابل قبول سمجھتا' وہ اسے اختیار کر لیتا۔ ایسا کرتے وقت وہ اچھی طرح جانتا کہ اس میں ذاتی ملکیت باقی نہیں رہے گی۔ اس طرح رفتہ رفتہ ان حضرات پر مشتمل ایک سوسائٹی وجود میں آ گئی جو قرآنی نظام زندگی کو بطیب خاطر اپنے لئے نظام حیات قرار دے چکے تھے۔ لہٰذا' ان کی صورت میں کرنے کا کام فقط اتنا تھا کہ باہمی مشاورت سے یہ سوچ اور طے کر لیا جائے کہ معاشرہ کے اس وقت کے حالات کے مطابق' اس نظام کو کس طرح عملاً وجود میں لایا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے انقلابی پروگرام کو بتدریج ہی انتہا تک پہنچایا جاسکتا تھا۔ چنانچہ اس کے لئے یہی طریق کار اختیار کیا گیا اور اس کے لئے خود قرآن میں رہنمائی موجود تھی۔ یہ جو ہم قرآن کریم میں صدقہ خیرات' قرض حسنہ' وراثت وغیرہ سے متعلق احکام وہدایات دیکھتے ہیں' وہ اسی

عبوری دور سے متعلق ہیں جس میں اس نظام کو تدریجاً اس کی آخری منزل کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اس کے تکمیل تک پہنچ جانے کے بعد، نہ اس معاشرہ میں کوئی محتاج و محروم رہ سکتا ہے جس کے لئے صدقہ و خیرات کی ضرورت پیش آئے، نہ ہی کوئی صاحبِ جائیداد ہو سکتا ہے جس کا اس قسم کا ترکہ اس کے پسماندگان میں تقسیم ہو۔ اس انقلاب کے داعی (رسول اللہ ﷺ) کی اپنی زندگی، شروع ہی سے اس انتہائی منزل کی آئینہ دار تھی۔۔۔ اور اسے ایسا ہونا بھی چاہئے تھا، کیونکہ اسے تو ہمیشہ تک کے لئے دوسروں کے لئے اسوۂ حسنہ (ماڈل) بننا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ نہ حضور ﷺ نے دولت جمع کی، نہ جائیدادیں کھڑی کیں۔ نہ زندگی میں کچھ پس انداز کیا، نہ وفات کے بعد کچھ ترکہ میں چھوڑا۔

ضمناً۔۔۔ نظامِ سرمایہ داری کے حامی حضرات (بڑی جرأت سے) کہہ دیتے ہیں کہ فلاں صحابیؓ کے پاس اس قدر دولت تھی اور فلاں کے پاس اس قدر خزانے۔۔ ان حضرات سے صرف ایک سوال پوچھنا چاہئے اور وہ یہ کہ آپ، ایک نقشہ رسولؐ اللہ کی زندگی کا پیش کرتے ہیں اور اس کے بالکل برعکس، دوسرا نقشہ، ان صحابہؓ کا۔ اب آپ یہ فرما دیجئے کہ ان دونوں میں سے کون سا نقشہ اسلام کی صحیح تعبیر کہلا سکتا ہے؟[1] رسولؐ اللہ کی زندگی کا نقشہ یا ان حضراتؓ کی زندگی کا (وہ نقشہ) جسے آپ پیش کرتے ہیں۔

آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ یہ حضرات ان دونوں نقشوں کو عین مطابق اسلام قرار دیں گے! اور (صرف) ان دو نقشوں پر ہی کیا موقوف ہے، ان کے پیش کردہ تصور کی رو سے تو ہر قسم کے متضاد اور باہمد گر متخالف و متبائن نظریات و تصورات (بلکہ ان کی عملی شکلیں بھی) سب اسلام ہیں! ان کے تصورِ اسلام کی رو سے حضرت ابوذر غفاریؓ کا مسلک (جو جمع کردہ دولت کو جہنم کی آگ قرار دیتے تھے) بھی عین مطابق اسلام تھا، اور حضرت عثمانؓ کا مسلک بھی (جن کے پاس بقول ان کے، دولت کے انبار در انبار تھے) عین اسلامی۔ ان کے نزدیک، مسلمان سلاطین کے حق میں خلد اللہ ملکہ اور ایدہ اللہ بنصرہ کی مقدس دعائیں کرنے والے علماء کرام بھی ''رحمہم اللہ تعالیٰ'' ہیں اور ملوکیت کو ابلیسی نظام قرار دینے والے بھی ''رحمہم اللہ تعالیٰ''۔ ان کے اسلام کی رو سے، موجودات عالم کو عین ذات خداوندی سمجھنے والے بھی ''شیخ اکبر'' کہلانے کے مستحق ہیں، اور ان کی تردید میں عمر بھر جہاد کرنے والے بھی ''مجدد اعظم''۔ ان میں سے ہر فرقہ، دوسرے فرقے پر کفر کے فتوے بھی لگاتا ہے، اور پھر ان تمام فرقوں کے مجموعہ کا نام امت محمدیہ بھی قرار دیتا ہے۔ سو جن کے اسلام کی یہ حالت ہو، وہ اگر رسول اللہ ﷺ کے نقشِ حیات اور ان کے بالکل برعکس، مسلک زندگی کو عین مطابق اسلام قرار دے لیں تو یہ کون سی تعجب کی بات ہے؟

بہر حال، ہم کہہ یہ رہے تھے کہ قرآنی نظام کے داعیٔ اول (حضور نبی اکرم ﷺ) نے جس سوسائٹی کو متشکل فرمایا۔ اس کا ہر ممبر اس اقرار کے ساتھ اس سوسائٹی میں داخل ہوا تھا کہ وہ قرآنی نظام کے تابع زندگی بسر کرے گا۔ لہٰذا، وہاں

---

(1) واضح رہے کہ ہمارے نزدیک تاریخ ایسے واقعات جو صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زندگی کو قرآنی تعلیم یا رسول اللہ ﷺ کی زندگی سے مختلف ثابت کرتے ہیں، وضعی اور ناقابلِ اعتبار۔ ہمارا ایمان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی قرآن کے مطابق اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زندگی رسول اللہؐ کی زندگی کے مطابق تھی۔

سوال صرف طریق کار کا تھا۔ لیکن ہماری حالت ان سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں ایک سوسائٹی پہلے سے موجود ہے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتی ہے۔ لیکن ان میں سے کوئی شخص بھی قرآنی نظام کو سمجھ کر، اس یقین و ایمان کے ساتھ اس سوسائٹی کا ممبر نہیں بنا کہ وہ اس نظام کو اپنے اوپر عملاً وارد کرنے، اور پھر اسے دنیا میں عام کرنے کے لئے، اس سوسائٹی میں شامل ہو رہا ہے۔ اتنا ہی نہیں، جس اسلام کی طرف وہ اپنی نسبت کرتا ہے، اس کے سامنے اس کا بھی کوئی متعین مفہوم نہیں۔۔۔ یہ بھی اسلام ہے اور وہ بھی اسلام۔۔۔ اور یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ جس نظریہ کا ایک، واحد، متعین اور منفرد مفہوم نہ ہو، بلکہ کہا یہ جائے کہ یہ مفہوم بھی صحیح ہے اور وہ مفہوم بھی صحیح۔۔۔ اس پر کسی کا مستحکم یقین نہیں ہوسکتا۔ قرآن نے جب (خدا کے ماننے والوں کے متعلق) کہا تھا کہ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ (2:137) (اگر یہ خدا کو اس تصور کے مطابق مانیں جو تمہارا تصور ہے تو پھر یہ سمجھا جائے گا کہ وہ صحیح راستے پر ہیں) تو اس سے یہی مقصود تھا۔۔۔ سبل متفرقہ (مختلف راستوں) کو یکساں ماننے والوں کو قرآن ایمان والے قرار ہی نہیں دیتا (6:154) اسلام، جب ایک نظریۂ حیات اور ضابطۂ زندگی ہے، تو اس کا مفہوم بھی ایک اور صرف ایک ہوسکتا ہے۔ ''مذہب'' چونکہ انفرادی چیز ہوتا ہے اس لئے اس میں اس سے کوئی حرج واقع نہیں ہوتا کہ ایک شخص نے اس کا کوئی مفہوم لے لیا اور دوسرے نے کوئی اور۔ لیکن دین تو اجتماعی نظام حیات کا نام ہے اس لئے اس میں مختلف مفاہیم لینے کی گنجائش ہی نہیں ہوسکتی۔ یہ جو ہر مسلمان کے لئے حکم ہے کہ وہ دنیا کے کسی حصے میں ہو، وہ اپنا ''رخ جانب قبلہ رکھے'' تو اس کا عملی مفہوم یہی تھا کہ دنیا کے ہر مسلمان کا نصب العین حیات ایک ہونا چاہئے۔ اسی کا نام توحید ہے اور یہی وجہ ہے قرآن نے، فرقہ بندی کو بالفاظِ صریح شرک قرار دیا ہے۔ (30:31)۔

لہٰذا، موجودہ مسلمانوں کی پہلی مشکل تو یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کو سمجھ سوچ کر، بہ طیب خاطر، بطور نظام حیات قبول نہیں کیا۔ اور ان کی دوسری دشواری یہ ہے کہ جس اسلام کی طرف یہ اپنی نسبت کرتے ہیں، اس کا کوئی ایک متعین مفہوم ان کے سامنے نہیں۔

اور تیسری دشواری یہ ہے (اور یہ سب سے اہم اور بنیادی دشواری ہے) کہ بہ ہیئت مجموعی، اسلام کا جو تصور، ہماری مذہبی پیشوائیت کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے، اسے اس اسلام سے دور کا واسطہ بھی نہیں جسے خدا نے اپنے رسول ﷺ کی وساطت سے عطا فرمایا تھا۔۔۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ نظام سرمایہ داری کو مسلمانوں کے تمام مذہبی فرقے عین اسلام قرار دیتے ہیں اور اسلام میں فرقوں کے وجود کو کوئی بھی شرک تسلیم نہیں کرتا! حالانکہ یہ دونوں چیزیں اسلام کی یکسر نقیض ہیں۔

یہ ہے وہ مقام جہاں ہم اس وقت کھڑے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان حالات میں کیا کیا جائے؟ ظاہر ہے کہ سب سے پہلا کرنے کا کام یہ ہے کہ

اسلامی نظام کا واضح مفہوم متعین کیا جائے۔۔۔۔۔ ایک متعین مفہوم۔

یہ کام مذہبی پیشوائیت کے بس کا نہیں۔ ہماری مذہبی پیشوائیت' فرقہ بندی کا شکار ہے اور فرقہ بندی میں (قرآن کے الفاظ میں) ہوتا یہ ہے کہ: كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (30:32) ہر فرقہ اپنے مسلک کو حق سمجھتا ہے اور اپنے عقائد میں ایسا مست ہوتا ہے کہ (اس کے خلاف کسی نظریہ کو حق سمجھنا تو درکنار) وہ اس پر تنقیدی نگاہ ڈالنا بھی کفر و الحاد کے مرادف سمجھتا ہے۔۔۔ فرقہ بندی قائم ہی اس قسم کی متشدد عصبیت سے رہ سکتی ہے۔۔۔ جو حضرات' ہزار برس سے یہ نہ طے کر سکے کہ نماز میں آمین اونچی آواز سے کہنی چاہئے یا نیچی سے' کیا وہ پورے کے پورے اسلامی نظام کا ایک متفق علیہ مفہوم متعین کر سکیں گے؟ ان سے ایسی توقع رکھنا خود فریبی ہے۔ گذشتہ دنوں امریکہ کے سابق وزیر خارجہ کا ایک انٹرویو اخبارات میں شائع ہوا جس میں پوچھا گیا کہ کیا امریکہ کو اس وقت سخت خطرہ لاحق نہیں ہو جائے گا جب پاکستان میں حقیقی اسلامی نظام نافذ ہو جائے گا۔ سابق امریکی وزیر نے نہایت اطمینان سے جواب دیتے ہوئے کہا کہ اس کا کوئی امکان نہیں کیونکہ ہر فرقہ کی فقہ اور اسلام کی تعبیر مختلف ہے یہ عملاً ناممکنات میں سے ہے لہٰذا امریکہ کو پاکستان سے کوئی خطرہ لاحق نہیں ہو سکتا۔

ہمارے نزدیک یہ کام مملکت کی طرف سے ہو سکتا تھا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ اسلام میں نہ دین و دنیا دو الگ الگ شعبے ہیں اور نہ ہی انسانی زندگی کو مختلف خانوں (Compartments) میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا' اسلامی مملکت کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ امت کی پوری کی پوری زندگی کے متعلق ضوابط مقرر کرے۔ ظاہر ہے کہ مملکت کی طرف سے متعین کردہ ضابطہ قوانین ساری قوم کے لئے ایک ہی ہو سکتا ہے۔۔۔ اس میں' دین و دنیا کی تفریق تو ایک طرف' شخصی اور پبلک لاز کی تفریق بھی نہیں ہو سکتی۔ یہ تھا وہ مقصد جس کے لئے پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا۔۔۔ یعنی

اسلامی نظام کا مفہوم متعین کر کے اسے ملک میں عملاً نافذ کرنا۔

مذہبی پیشوائیت تو ایسا کر نہیں سکتی تھی اس لئے اس نے نہ اب تک ایسا کیا' نہ ہی ایسا وہ کبھی کر سکے گی۔ لیکن ہمارے ہاں کی مملکت نے' ایسا کر سکنے کے باوجود' ایسا نہ کیا۔

لیکن کسی نے ایسا کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ اس کے بغیر نہ مملکت اسلامی بن سکتی ہے' نہ موجودہ مسلمان' مسلمان کی زندگی بسر کر سکتا ہے۔

اسلامی نظام کا مفہوم متعین کرنے کے بعد' اگلا مرحلہ یہ ہوگا کہ اس مفہوم کو دلائل و براہین کی رو سے سمجھایا جائے۔ اور نہایت محبت اور شفقت سے مسلمانوں کے سامنے پیش کر کے ان سے کہا جائے کہ وہ اس پر اچھی طرح سے غور و فکر کر لیں' سمجھ سوچ لیں اور اس کے بعد اس کا فیصلہ کر لیں کہ وہ اس کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں یا نہیں۔ اگر وہ ایسا نہ کرنا چاہیں تو پھر ہمیں اسلام کے احیاء کا خیال چھوڑ دینا چاہئے اور اگر وہ اس پر رضامند ہوں تو پھر یہ ہوگی وہ سوسائٹی جو بیٹھ کر سوچے گی اور اس کا فیصلہ کرے گی کہ اس نظام کو اس کی آخری منزل تک لے جانے کے لئے تدریجی پروگرام کیا بنایا جائے۔ واضح رہے کہ

ان کا نصب العین تو وہی ہوگا جو مفہوم انہوں نے اسلامی نظام کا متعین کیا تھا۔ سوال صرف اس نصب العین تک پہنچنے کے عملی وسائل و ذرائع اور طرق و اسالیب کا ہوگا۔

سوال یہ ہے کہ مملکت اس قسم کا مفہوم کس طرح متعین کرے گی اور اس کے صحیح ہونے کا معیار کیا ہوگا؟ اس سوال کا جواب خدا نے خود اپنی کتاب میں دے دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ:

(1) جو اپنے معاملات کے فیصلے اس کتاب کے مطابق، جسے خدا نے نازل کیا ہے، نہیں کرتے، وہ مسلمان نہیں، کافر ہیں۔ (5:44)۔

(2) اس کتاب میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ (4:82)

(3) یہ مکمل بھی ہے اور غیر متبدل بھی۔ (6:116)

(4) یہ سمجھنے کے لئے بڑی آسان ہے۔ (54:40)

(5) یہ حرفاً حرفاً محفوظ ہے۔ (15:9)

سوچئے کہ جس کتاب کا یہ دعویٰ ہو، اس سے (اس قوم کے لئے جو اس کے ان دعاوی کے سچا ہونے پر ایمان رکھتی ہو) اسلامی نظام کا واحد مفہوم متعین کر لینا کچھ بھی مشکل ہے؟ ہوسکتا ہے کہ ابتدائی کوشش میں، اس میں جزئی طور پر کوئی سقم رہ جائے، لیکن مزید غور و خوض سے وہ بآسانی رفع ہوسکتا ہے۔ بنیادی چیز تو قرآن کو بطور معیار تسلیم کرنا ہے۔ ایک غیر متبدل معیار کی موجودگی میں کسی سہو و خطا کی تصویب چنداں مشکل نہیں ہوتی اور جب وہ معیار ایسا ہو جس میں کوئی بات اختلافی نہ ہو، تو یہ بھی ناممکن ہے کہ اس سے دو متضاد معاشی نظاموں کا جواز نکل آئے۔

یہ ہے وہ طریق جس کے مطابق، قرآنی نظام پاکستان میں نافذ کیا جا سکتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ اس کے نفاذ کے طریق میں بھی، کمیونزم اور قرآنی نظام میں، کس قدر بنیادی فرق ہے۔ کمیونسٹ اپنے نظام کو قوت کے ذریعے مسلط کرتے ہیں، لیکن قرآن کا اعلان ہے کہ دین (نظام زندگی) کے باب میں کسی قسم کا جبر و اکراہ جائز نہیں (2:256) یہ بہ طیب خاطر قبول کرنے اور دل و دماغ کے کامل اطمینان سے قائم رکھنے کی چیز ہے۔ اور (منجملہ دیگر امور) یہ بھی ایک وجہ ہے کہ کمیونزم کا نظام بزور مسلط تو کیا جا سکتا ہے، آگے نہیں چلایا جا سکتا۔ خود ہماری تاریخ میں بھی یہی ہوا جس معاشرہ نے اسے سمجھ سوچ کر بطیب خاطر قبول اور اختیار کیا تھا، اس نے اسے نہایت عمدگی سے چلایا۔ لیکن اس کے بعد جو لوگ، محض میدان جنگ میں شکست کھا جانے کے بعد، اس سوسائٹی میں شامل ہو گئے، وہ اسے آگے نہ چلا سکے۔ فاتح قوم (مسلمانوں) نے ان لوگوں سے اسلام، بزور شمشیر نہیں منوایا تھا۔ اسے انہوں نے از خود اختیار کیا تھا لیکن اسے اختیار سمجھ سوچ کر نہیں کیا تھا بلکہ فاتح قوم کی عظمت و شوکت کو دیکھ کر، ان کی تقلید میں اسے اختیار کر لیا تھا۔ اس طرح اسلام قبول کر لینے اور سمجھ سوچ کر قلب و دماغ کے کامل اطمینان کے بعد ایمان لانے میں یہی فرق تھا جس کے پیش نظر قرآن

کریم نے ان صحرانشین عربوں کے متعلق۔۔۔ جو اسلامی مملکت کی شان وشوکت کو دیکھ کر' اسلام لے آئے تھے۔۔۔ واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ ''ان سے کہہ دو کہ یہ' یہ نہ کہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں' صرف یہ کہیں کہ ہم اس مملکت کے سامنے جھک گئے ہیں۔ کیونکہ ابھی تک ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا۔(49:14)۔قرآنی نظام صرف اس سوسائٹی کے ہاتھوں قائم ہوسکتا ہے ''جس کے دل کی گہرائیوں میں ایمان اتر چکا ہو۔''

اور اس کا طریق یہ ہے کہ اس سوسائٹی کی ہر نئی نسل کی تعلیم اس نہج سے کی جائے کہ وہ اس نظام کی صداقت کو دلائل و براہین کی رو سے اپنے سامنے بے نقاب دیکھ لیں۔ اگر انکی تعلیم وتربیت کا سلسلہ اس طرح جاری رکھا جائے' تو پھر یہ قوم اس نظام کو نہایت عمدگی سے چلاتی جائے گی۔

یہ ہے ہماری بصیرت کے مطابق وہ طریق جس سے ہم قرآنی نظام کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکتے ہیں۔لیکن اگر ہم سمجھتے ہیں کہ اس قسم کی تبدیلی ناممکن ہے تو پھر ہمیں' نہایت دیانتداری سے' اسلامی نظام کا نام لینا چھوڑ دینا چاہئے۔ ہم جس انداز سے اس وقت اسلامی نظام کی ''مہارنی'' پکار کر رہے ہیں۔ اس نظام سے مذاق ہے اور جو کچھ ''اسلام کے لئے'' کر رہے ہیں' اس سے اسلام اور زیادہ' نگاہوں سے اوجھل ہوتا چلا جا رہا ہے۔ موجودہ اسلام' بالعموم ہمارے دورِ ملوکیت' جاگیرداری اور سرمایہ داری کا وضع کردہ ہے' اس لئے اس کی تقویت کے لئے سامان بہم پہنچانا' خلاف اسلام نظریات ومسالک کی پرورش کرنا ہے۔ یہ ہمارے مکتب' مدرسے' دارالعلوم' یہ اسکولوں اور کالجوں میں اسلامیات کے نصاب' یا دوسری طرف یہ اسلامی مشاورتی کونسلیں اور تحقیقاتی ادارے'۔۔غرضیکہ خدمت اسلام کے نام سے جو کچھ ہو رہا ہے' یہ اگر اسلام کے نام سے ابلہ فریبی نہیں تو خود فریبی ضرور ہے۔ اور اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ خود فریبی سے حقائق نہیں بدل جایا کرتے۔ آپ کتنی ہی نیک نیتی سے ببول کے پیڑ کی آبیاری اور نشوونما کرتے رہیں' اس سے انگوروں کے خوشے حاصل نہیں ہوسکیں گے۔ اگر آپ انگور حاصل کرنا چاہتے ہیں تو یہ ضروری ہے کہ ببول کے پیڑ کو جڑ سے اکھیڑ کر اس کی جگہ انگور کی بیل کاشت کریں۔ یہ ہے سنت اللہ۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَحْوِیْلًا (35:43) (سنت اللہ میں کبھی تبدیلی نہیں ہوا کرتی) اسی لئے اقبالؔ نے احیاء اسلام کے لئے تعمیر نو (Re-Construction) کا تصور دیا تھا' اس کی موجودہ عمارت میں رنگ وروغن کا نہیں' اور اس تعمیر نو کا معیار یہ دیا تھا کہ

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

غلام احمد پرویزؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیغام برِ انقلاب ﷺ

(10 جون 1968ء کو میلاد النبی ﷺ کی تقریب پر وائی ایم سی اے ہال (لاہور) میں دیا گیا پرویزؒ کا خطاب)

صدرِ محترم و عزیزانِ گرامی قدر! سلام و رحمت

موجودہ تقریبات:

ربیع الاول کا مقدس مہینہ، نور و نکہت کی ہزار جنت سامانیاں اپنے جلو میں لئے، پھر وجہِ تابانیٔ عالم ہوا۔ جیسا کہ میں نے، ایک دفعہ اسی تقریب کے سلسلہ میں کہا تھا، میرے نزدیک، ہمارے ہاں جشن مسرت کے تیوہار دو ہی ہیں۔۔۔ ایک جشن نزول قرآن، کہ جسے عید الفطر کہا جاتا ہے، اور دوسرا عید میلاد النبیؐ۔ اور اصل یہ ہے کہ یہ دونوں تیوہار بھی ایک ہی سکہ کے دو رخ اور ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ قرآن، حرف و نقوش میں خدا کا کلام ہے اور سیرت صاحبِ قرآن، خود قرآن کی محسوس تعبیر اور درخشندہ تفسیر۔ سیرت طیبہ کی یہی اہمیت تھی جس کی وجہ سے اس کے اصولی گوشوں کو خود قرآن نے اپنے دامن میں محفوظ کر کے اسے ابدیت در کنار کر دیا۔ ہمارے ہاں کچھ عرصہ سے اس تقریب کو بڑے جوش و خروش سے منایا جاتا ہے۔ لیکن، جیسا کہ ہر اس قوم کے ہاں ہوتا ہے جو عقل و فکر اور علم و بصیرت سے کام لینے کے بجائے اپنے معاملات کو جذبات کے طوفانوں کی نذر کر دے، یہ تقریب کسی بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ بننے کے بجائے، محض نمائشوں اور آرائشوں کا بے روح مظاہرہ بن کر رہ گئی ہے۔ ان جلوسوں کو چھوڑیئے جن میں ہر قسم کی بازاریت کے مظاہرے ہوتے ہیں، آپ میلاد کی کسی مجلس میں جایئے، وہاں جھوم جھوم کر نعتیں پڑھی جائیں گی، لیکن ان نعتوں میں ہوگا کیا؟ زلف و خط و خال کے حسین تذکرے، کاکلِ مشکیں اور گیسوئے عنبریں کی شیریں حکایتیں، سرو قامتی اور لالہ رخساری کی دل افروز داستانیں۔ ہجر و وصال کے جانسوز افسانے، اور اب تو انتہا یہ ہے کہ ان نعتوں کی دھنیں بھی فلمی گیتوں سے نقل کی جاتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر آپ تھوڑے سے وقت کے لئے آنکھیں بند کر لیں، تو تمیز ہی نہ ہو سکے کہ آپ میلاد کی مقدس مجلس میں بیٹھے ہیں یا کسی سینما ہال میں۔

اور اگر آپ میلاد کی مجلس سے اٹھ کر، وعظ کی محفل کی طرف جائیں تو وہاں آپ کو یا تو اس قسم کی بحثیں سنائی دیں گی کہ حضورؐ نور تھے یا بشر۔ اور یا آپؐ کے معجزات کا محیر العقول بیان ہوگا۔ میں اس وقت معجزات کی بحث میں نہیں الجھنا چاہتا۔ میں

صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ نبی اکرم ﷺ کے متعلق خدا نے کہا تھا کہ:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (33:21)

تمہارے لئے رسول کی زندگی میں ایک بہترین نمونہ ہے۔

ظاہر ہے کہ جب معجزات کا ظہور ہم سے ممکن ہی نہیں تو حضور ﷺ کے معجزات ہمارے لئے اسوہ (ماڈل) کس طرح بن سکتے ہیں۔ ہمارے لئے تو آپ ﷺ کی سیرت طیبہ کا وہی حصہ نمونہ بن سکے گا جسے ہم خود عمل میں لا سکیں۔

اور اگر آپ' ان محفلوں کو چھوڑ کر' کسی ماڈرن جلسہ گاہ میں جا پہنچیں تو وہاں بھی زیادہ سے زیادہ یہی کہا جائے گا کہ بعثت نبی اکرم ﷺ سے پہلے عربوں میں اس قدر خرابیاں تھیں۔۔شراب ان کی گھٹی میں پڑی تھی' جوئے کے وہ بے حد رسیا تھے۔ فحش کلامی ان کی محفلوں کی زینت تھی' بات بات پر مشتعل ہو کر جنگ وقتال پر اتر آنا' ان کا انداز زیست بن چکا تھا۔۔آپؐ نے ان کی ان خرابیوں کو دور کیا اور انہیں ایک مہذب اور شائستہ قوم بنا دیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ معاشرہ کی اس قسم کی خرابیوں کی اصلاح' قابل ذکر کارنامہ ہے لیکن سوال یہ ہے کہ خدا کا ایک ایسا جلیل المرتبت رسول' جو نبوت کے سلسلہ دراز کی آخری کڑی ہو اور جس کے پیغام نے' تمام نوع انسان کے لئے قیامت تک ضابطۂ زندگی بننا ہو' کیا اس کا کارنامہ اتنا ہی تھا کہ اس نے چند معاشرتی خرابیوں کی اصلاح کر دی اور اس قوم کو ایک وسیع سلطنت کا وارث بنا دیا؟ اس قسم کی حاصل کائنات' برگزیدۂ روزگار ہستی کے کارنامے یقیناً اس سے کہیں زیادہ عظیم اور کہیں بڑھ کر جلیل ہوں گے۔ جس ذات گرامی ﷺ کو خود خدا نے رحمۃ للعالمین قرار دیا تھا اس کے سحاب کرم کی گہر باریوں کو حدود فراموش اور قیود نا آشنا ہونا چاہئے اور وہ ایسی ہی تھیں۔

رسول ﷺ کی بعثت کا مقصد:

ایک رسول کی بعثت کا مقصد کیا ہوتا ہے' اسے علامہ اقبالؔ نے اپنے خطبات میں' ایک مقام پر' نہایت مختصر لیکن بڑے جامع اور بلیغ انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> رسول' اس لئے آتا ہے کہ زمانے کے طوفانوں پر تسلط پا کر تاریخ کی قوتوں کو اپنے قابو میں لے آئے اور اس طرح مقاصد کی ایک نئی دنیا تعمیر کر دے (مضرابِ وحی سے) اس کے نفس قدسی میں ایسی ولولہ انگیز قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ دنیائے انسانیت میں ایک انقلاب برپا کر دیں۔ یہ آرزو' کہ جو کچھ اس نے (وحی کی روشنی میں) دیکھا ہے' وہ ایک جیتی جاگتی دنیا کے پیکر میں متشکل ہو جائے' نبی کے دل میں پیش پیش ہوتی ہے۔ اس لئے ایک صاحبِ وحی کے تجربہ کی قدر و قیمت جانچنے کا ایک طریق یہ بھی ہوتا ہے کہ دیکھا جائے کہ اس نے انسانیت کو جس قالب میں ڈھالا ہے وہ کیا ہے اور اس کے پیغام کی روح سے جس قسم کی دنیائے ثقافت ابھر کر سامنے آ گئی ہے وہ کس انداز کی ہے۔

بالفاظِ دیگر' ایک رسول آتا اس لئے تھا کہ جو دنیا اس کے سامنے ہو اس کی جگہ ایک نئی دنیا تعمیر کر دے۔ لیکن یہ ظاہر ہے

کہ خارجی کائنات میں ایک نئی دنیا بسانے کے لئے، اسے دلوں کی دنیا کو بدلنا پڑتا ہے۔ انسانی فکر ونظر میں ایک انقلابِ عظیم برپا کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ؎

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود کہ سنگ وخشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

وہ دنیا کے مروجہ اعتقادات، نظریات، تصورات، خیالات کو ایک ایک کر کے لیتا ہے اور ان کی بنیادوں تک کو اکھیڑ کر، ان کی جگہ جدید تصورات ونظریات کی دنیا بساتا ہے وہ نگاہوں کے زاویے بدل دیتا ہے۔ وہ اقدار کے پیمانے بدل دیتا ہے، وہ خیر وشر کا معیار بدل دیتا ہے، وہ نصب العینِ حیات بدل دیتا ہے، وہ کاروان انسانیت کی منزلِ مراد بدل دیتا ہے، وہ زندگی کا مقصود بدل دیتا ہے۔ مقصود کا مفہوم بدل دیتا ہے۔ غرضیکہ وہ قرآن کی زبان میں۔۔ یہ زمین بدل دیتا ہے۔ یہ آسمان بدل دیتا ہے اور ان کی جگہ ایک نئی زمین کی تخلیق کرتا ہے۔ ایک نیا آسمان وجود میں لاتا ہے۔ اس کی نگاہ، انسانی فکر کی دنیا میں زلزلہ پیدا کر دیتی ہے، جس سے ہر بنائے کہنہ ویران ہوجاتی ہے اور اس تخریب کے بعد وہ فکر ونظر کے ان ویرانوں میں، دنیائے تصورات کی ایک نئی جنت آباد کرتا ہے۔ ایک رسول درحقیقت

پیغام برِ انقلاب

ہوتا ہے۔ ایک عظیم انقلاب کا پیغام بر۔۔۔ ایسے عظیم انقلاب کا پیغام بر جس کا تصور تک بھی فکر انسانی نہیں کرسکتی۔۔ نظریات ومعتقدات کی دنیا میں انقلاب برپا کرنا، کس قدر مشکل ہوتا ہے۔ چھوٹے سے پیمانے پر اس کا اندازہ آپ بھی کر سکتے ہیں۔ آپ اپنے کسی دوست سے اس کی عزیز سے عزیز دنیاوی متاع مانگیں، وہ بخوشی دے دے گا۔ لیکن آپ اس کے کسی عقیدہ کو غلط کہہ دیں، آپ دیکھئے گا کہ اس سے دوستی کے کتنے کتنے مضبوط رشتے ٹوٹ جاتے اور رفاقتوں کے کیسے کیسے محکم عہد وپیمان ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتے ہیں۔ رسول، یہ آسمانی انقلاب کا داعی، کسی ایک فرد کے عقیدے کو غلط نہیں ٹھہراتا۔ وہ سارے معاشرہ کے عقیدے کی تغلیط کرتا ہے اور معاشرہ کے کسی ایک عقیدہ کی تردید وتکذیب نہیں کرتا، اس کے تمام معتقدات و نظریات کو باطل ٹھہراتا ہے۔ اسی کا نام، قرآن کی اصطلاح میں، ''کفر بالطاغوت'' ہے جو ایمان باللہ کی تمہید ہوتا ہے۔ یہی لا الٰہ، اس داعیٔ انقلاب کے پروگرام کی پہلی اور لاینفک کڑی ہوتی ہے۔ وہ جب تک دلوں کے کعبہ سے ہر کہنہ صنم کو نکال باہر نہیں کرتا، اس کے اندر قدم نہیں رکھتا۔ یہی وہ ہمت طلب اور شکیب آزما مرحلہ تھا جسے قرآن نے ایک حوصلہ شکن فریضہ قرار دیا تھا جب کہا تھا کہ: وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۝ الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۝ (94:2-3) ''ہم نے تمہارے سر سے اس بوجھ کو اتار دیا جس نے تمہاری کمر توڑ رکھی تھی۔''

دنیائے مذہب میں انقلاب:

اس قسم کی انقلاب آفرینی، دنیائے تہذیب اور جہان تمدن میں بھی کچھ کم مشکل نہیں ہوتی، لیکن مذہب کے تراشیدہ بتوں کو توڑنا اور توڑنا بھی مذہب ہی کے تیشوں سے، انتہائی جانگسل اور (بظاہر) ناممکن العمل پروگرام ہوتا ہے۔ اگر کوئی دہریہ

اور مادہ پرست' مذہبی تصورات کی تردید کرے تو اس کی یہ حرکت قابل فہم ہوگی۔ لیکن مذہب کے اسٹیج پر کھڑے ہو کر مذہب کے خلاف دعوت انقلاب دینا' نہ صرف دشوار ترین فریضہ ہوگا بلکہ محیر العقول اقدام بھی۔ میں آج کی نشست میں' عزیزان گرامی قدر! مختصر الفاظ میں یہ عرض کروں گا کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے خود مذہب کے مسلمات میں کس قدر عظیم انقلاب برپا کیا' اور یوں عالمگیر انسانیت کو' انسانوں کے خود تراشیدہ معتقدات کی ان زنجیروں سے چھڑایا جن میں وہ صدیوں سے جکڑے چلی آ رہی تھی' اور جن کے خلاف لب کشائی کرنا تو ایک طرف' دل میں گرانی تک محسوس کرنا بھی' کس طرح ان کی روح میں کپکپی پیدا اور دلوں میں لرزہ طاری کر دیتا تھا اور یہی حضور ﷺ کا وہ معرکہ آرا کارنامہ ہے جس کی وجہ سے' عالم انسانیت' قیامت تک' اس محسن اعظمؐ کا زیر بار احسان رہے گا۔ وَمَا تَوْفِيقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ط۔

خدا کا غلط تصور:

مذہب کی دنیا میں' بنیادی تصور خدا کا ہے (ایک آدھ کو چھوڑ کر) تمام مذاہب عالم میں مذہب پرست ہونے کے لئے خدا پر ایمان شرط اولین ہے۔ لیکن نبی اکرم ﷺ کے ظہور قدسی سے پہلے' تمام مذاہب میں خدا کا تصور ایک مطلق العنان' مستبد آمر (ڈکٹیٹر) کا سا تھا' جس کے ہاں نہ کوئی قاعدہ تھا نہ قانون۔ نہ کوئی دستور تھا نہ آئین۔ وہ جو جی میں آئے کرتا اور جس قسم کا جی چاہے حکم صادر کر دیتا تھا۔ دنیا کے شہنشاہوں کی طرح' وہ اپنے تخت حکومت پر بیٹھا' انتہائی دبدبہ اور جلال سے حکمرانی کرتا تھا۔ اس کی کیفیت یہ تھی کہ (سعدی کے الفاظ میں) گاہے بسلامے برنجدو گاہے بہ دشنامے خلعت بہ بخشد۔۔ کبھی موج میں آ گیا تو گالیاں دینے والوں کو جاگیریں عطا کر دیں۔ غصہ میں آ گئے تو سلام کرنے والے کو پھانسی پر لٹکا دیا۔ وہ جو کرتا تھا اس کے لئے اسے نہ کسی کو وجہ جواز بتانے کی ضرورت تھی نہ دلیل وحکمت بیان کرنے کی حاجت۔ موت اور زندگی' خوش حالی اور تنگ دستی' امیری اور غریبی' عزت اور ذلت' سب اس کے قبضہ قدرت میں تھی۔ وہ جس سے خوش ہوتا ایک آن میں لاکھوں کا مالک بنا دیتا اور جس سے ناراض ہوتا اسے نان شبینہ تک کا محتاج کر دیتا۔ اس کے سامنے کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ نہ کوئی اس سے پوچھ سکتا تھا کہ اس نے اسے کیوں تباہ کر دیا۔ نہ اتنا دریافت کر سکتا تھا کہ اسے کس جرم کی پاداش میں اس قدر سخت سزا دی گئی۔ یہ سب اس کی خوشی اور ناراضگی پر منحصر تھا۔ اس لئے ہر ایک کی ہر وقت یہ خواہش اور کوشش رہتی کہ وہ کسی نہ کسی طرح خدا کو خوش رکھے (دنیاوی بادشاہوں کی طرح) اسے خوش رکھنے کے لئے کبھی اس کی ثناء میں حمد وستائش کے قصیدے پڑھے جاتے اور کبھی اس کے حضور رو رو کر' اور گڑگڑا گڑگڑا کر' رحم کی درخواستیں کی جاتیں۔ کبھی اس کی بارگاہ میں نذرانے پیش کئے جاتے اور کبھی اسے قربانیوں اور چڑھاووں سے خوش کیا جاتا۔ لیکن یہ کچھ کرنے کے باوجود' ہر شخص اس کے عتاب سے ڈرا ڈرا' سہما سہما رہتا' کہ نہ جانے وہ کس وقت غصہ میں آ کر کیا کر دے۔

خدا کے مقربین:

دنیاوی بادشاہوں کی طرح' خدا کا ایک دربار بھی ہوتا تھا جس میں اس کے ''مقربین'' اس کے گرد وپیش مسند نشین

ہوتے۔ باہر حاجب و دربان ہوتے' اس لئے اس تک کسی شخص کی براہ راست رسائی نہ ہوسکتی۔ اس تک درخواست پہنچانے کے لئے وسیلوں اور سفارشوں کی ضرورت تھی اور یہ وسیلے اور سفارشی وہی تھے جو اپنے آپکو اس کا مقرب کہتے تھے۔ عوام بیچاروں کے کام' ان کے وسیلوں اور سفارشوں کے بغیر نکل ہی نہیں سکتے تھے۔ اس لئے انہیں خدا کی ہی خوشامد نہیں کرنی پڑتی تھی' ان مقربین کے حضور بھی ہر وقت سجدہ ریز رہنا پڑتا تھا۔ ان مفلسوں اور غریبوں' مظلوموں اور بیکسوں' محتاجوں اور لاچاروں کے دل پر خدا کا خوف ہی مسلط نہیں رہتا تھا۔ یہ ''مقربین بارگاہ خداوندی'' بھی ان کے اعصاب پر ہوّا بن کر سوار رہتے تھے۔

مفاد پرست گروہوں کا تراشیدہ تصور:

خدا کا یہ تصور درحقیقت' مفاد پرست گروہوں کا پیدا کردہ تھا۔ اس گروہ میں سرفہرست خود بادشاہ تھا جو اپنے آپ کو خدا کا اوتار' یا ظل اللہ علی الارض (زمین پر خدا کا سایہ اور عکس) قرار دیتا تھا۔۔ خدا کا یہی تصور تھا جو اس زمانے کے مطلق العنان بادشاہوں اور مہاراجوں کو (Suit) کرتا تھا۔ ان کی ہر دھاندلی کی سند یہ تھی کہ وہ عین خدائی احکام اور فیصلوں کے مطابق تھی۔ جس طرح خدا کے کسی حکم یا فیصلہ کے خلاف' لب پر حرف شکایت لانا تو ایک طرف' دل کی گہرائیوں میں بھی کبیدگی محسوس کرنا' خدا کے عتاب کا مستوجب بننے کے لئے کافی تھا' اسی طرح حکمران کے کسی فیصلے سے سرتابی کا تصور بھی انتہائی گناہ سمجھا جاتا تھا۔ جس طرح' خدا سے کوئی چیز بطور استحقاق طلب نہیں کی جاتی تھی۔۔ بطور خیرات مانگی جاتی تھی۔۔ اسی طرح بادشاہ سے بھی اپنے حق کے طور پر کچھ نہیں مانگا جاسکتا تھا۔ سب کچھ اس کے رحم و کرم پر موقوف تھا۔

مذہبی پیشوائیت:

اس فہرست میں' بادشاہوں کے بعد' مذہبی پیشواؤں کا نمبر آتا ہے۔ یہ خدا کے مقرب سمجھے جاتے تھے۔ خدا تو نہ کسی کے سامنے آتا تھا' نہ کسی سے براہ راست بات چیت کرتا تھا۔ اس لئے یہ ''تقدس مآب گروہ'' خدا کا نمائندہ بن کر' زمین پر خدائی کرتا تھا۔ لوگوں کے دل میں' بادشاہ' بلکہ خدا کا اتنا ڈر نہیں تھا جتنا ان نمائندگان خدا کا خوف تھا۔ بادشاہ اور ان مذہبی پیشواؤں۔۔ فرعون اور ہامان۔۔ کا باہمی گٹھ جوڑ تھا۔۔ یہ بادشاہ کو خدا کا اوتار قرار دے کر' لوگوں سے اس کے حضور سجدے کراتے' وہ انہیں ''روحانی مملکت'' کے ارباب بست و کشاد ٹھہرا کر' عوام سے ان کی پرستش کراتا۔

سرمایہ دار طبقہ:

نوع انسان کے ان شکاریوں میں' تیسرا درجہ ''جاگیرداروں' زمینداروں' سرمایہ داروں کا تھا''۔ جو رزق کے سرچشموں پر قابض ہوکر' مزدور اور محنت کش طبقہ سے اپنی من مانی کراتے۔ مذہبی پیشوائیت' ان مفلوک الحال' مفلس و محتاج محنت کشوں کو یہ کہہ کہہ کر سلائے رکھتی کہ چونکہ رزق کی بست و کشاد خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے اس لئے ان سرمایہ داروں کی بے حد و حساب دولت پر حسد کرنا یا اپنی مفلوک الحالی پر شکوہ سنج ہونا' خدائی فیصلے کے خلاف سرکشی کرنا ہے۔ اس لئے اس کا خیال تک

بھی دل میں نہیں لانا چاہئے۔ انسان کے لئے نہایت ضروری ہے کہ ہر حال میں راضی برضا رہے۔ دنیا کی عیش سامانیاں اگر امیروں کے حصہ میں آئی ہیں تو اس پر افسردہ ہونے کی کیا بات ہے۔ یہ دنیا چند روزہ ہے۔ اس کے بعد اُخروی زندگی کی ابدی مسرتیں سب غریبوں کے حصے میں آئیں گی۔

انسان کی حالت:

یہ تھا بعثت محمدیہؐ کے وقت خدا کا تصور اور اس کے تابع انسان کی حالت' اقبالؔ کے الفاظ میں اس وقت کیفیت یہ تھی کہ۔

بود انساں در جہاں انساں پرست — ناکس و نابود مند و زیر دست
سطوت کسریٰ و قیصر رہزنش — بندہا در دست و پاء و گردنش
کاہن و پاپاو سلطان و امیر — بہر یک نخچیر' صد نخچیر گیر!

یہ تھی انسان کی زار و زبوں حالت' جب حضور نبی اکرم ﷺ تشریف لائے۔ آپؐ آئے اور دنیا کے تمام ''خدا پرستوں'' کو مخاطب کر کے یہ انقلاب آفریں اعلان فرمایا کہ خدا کا یہ تصور تمہاری اپنی مفاد پرستیوں اور چیرہ دستیوں کا تراشیدہ ہے۔ اسے حقیقی خدا سے کوئی تعلق نہیں۔ حقیقی خدا وہ ہے جس نے اس کارگہ کائنات کو پیدا کیا اور پھر ہر شے کے لئے ایک اندازہ' پیمانہ اور قانون مقرر کر دیا جس کے مطابق وہ زندگی بسر کرتی ہے۔ خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا (25:2)۔ لہٰذا یہاں کسی مستبد' مطلق العنان حاکم کی آمریت کارفرما نہیں۔ یہاں ہر کام..... قاعدے اور قانون' دستور اور آئین کے مطابق سرانجام پاتا ہے۔ جسے خدا کا امر (یعنی حکم) کہا جاتا ہے وہ درحقیقت قانون ہی کا دوسرا نام ہے۔ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا ﴿۳۸﴾ (33:38) یہ قوانین غیر متبدل ہیں' اور ہر ایک پر یکساں طور پر نافذ۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (33:62)۔ یہ قوانین' خارجی کائنات میں' قوانین فطرت کی اصطلاح سے متعارف ہیں اور انسانوں کے لئے اس قسم کے غیر متبدل قوانین' وحی کی رو سے دیئے گئے ہیں جو کتاب اللہ (قرآن کریم) کے اندر محفوظ ہیں۔ خدا کا انسانوں کے ساتھ تعلق انہی قوانین کے ذریعے سے ہے۔ براہ راست کوئی تعلق نہیں۔ جب کوئی شخص کتاب اللہ کر پڑھتا ہے تو خدا اس سے ہمکلام ہوتا ہے اور جب وہ اس پر عمل کرتا ہے تو وہ خدا کے منشاء کو پورا کرتا ہے۔

قانون کی کارفرمائی:

ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے سے خود انسانوں ہی کا بھلا ہوتا ہے' خدا کا کچھ نہیں سنورتا۔ نہ ہی ان کی خلاف ورزی سے خدا کا کچھ بگڑتا ہے۔ اس لئے خدا کے خوش یا ناراض ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ ۖ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ؕ (17:7)۔ ''اگر تم اچھے کام کرو گے تو اس کا فائدہ تمہیں ہی پہنچے گا اور اگر غلط روش اختیار کرو گے تو اس کا نقصان بھی تم ہی اٹھاؤ گے''۔ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ﴿۳۸﴾ (53:38) ''کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا''۔

یہ واضح ہے جہاں قانون کی کارفرمائی ہو وہاں نہ کسی کی خوشامد درآمد کی ضرورت ہوتی ہے نہ رشوت اور نذرانے کی۔ وہاں نہ کسی وسیلے کی احتیاج ہوتی ہے نہ کسی سفارشی کی تلاش۔ وہاں نہ کسی سے بے انصافی ہوتی ہے نہ کسی کی رورعایت۔ وہاں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ: لَّا تَجۡزِیۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَیۡئًا وَّلَا یُقۡبَلُ مِنۡهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا یُؤۡخَذُ مِنۡهَا عَدۡلٌ وَّلَا هُمۡ یُنۡصَرُوۡنَ (2:48)۔ ''وہاں نہ کوئی شخص کسی دوسرے کے بدلے میں اپنے آپ کو پیش کر سکے گا' نہ کسی کی سفارش کام آ سکے گی' نہ ہی کوئی شخص کچھ فدیہ (یا رشوت) دے کر چھوٹ سکے گا نہ ہی کوئی کسی دوسرے کی کسی قسم کی مدد کر سکے گا''۔ قانون کی یہی کارفرمائی تھی جس کے پیش نظر نبی اکرم ﷺ نے' اپنی حیات دنیوی کی آخری ساعتوں میں اپنی چاہتی بیٹی' حضرت فاطمہؓ سے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ:

فاطمہؓ! خدا کے ہاں' محمد ﷺ کی بیٹی ہونا تمہارے کسی کام نہیں آ سکے گا۔ وہاں صرف تمہارے اپنے اعمال کام آ سکیں گے۔

نہیں! اس سے بھی آگے بڑھیے۔ آپ ﷺ نے خود اپنے متعلق فرما دیا کہ: اِنۡ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوۡحٰۤی اِلَیَّ ۚ۔ میں خود خدا کے قوانین ہی کا اتباع کرتا ہوں جو اس نے بذریعہ وحی عطا فرمائے ہیں۔ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اِنۡ عَصَیۡتُ رَبِّیۡ عَذَابَ یَوۡمٍ عَظِیۡمٍ (10:15)۔ اگر میں بھی ان قوانین کی خلاف ورزی کروں تو اس کا خمیازہ مجھے بھی بھگتنا پڑے گا۔ اس سے مجھے بھی کوئی نہیں بچا سکے گا۔

مصیبتوں کا ذمہ دار کون ہے؟

غور فرمایا آپ نے' عزیزان گرامی قدر! کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے خدا کا کس قسم کا تصور پیش کیا اور یہ تصور عالم انسانیت میں کس قدر عظیم انقلاب کا اعلان تھا! آپ نے تمام انسانوں کو مخاطب کر کے کھلے الفاظ میں فرما دیا کہ یاد رکھو۔ مَاۤ اَصَابَكُمۡ مِّنۡ مُّصِیۡبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتۡ اَیۡدِیۡكُمۡ (42:30)۔ جو مصیبت بھی تم پر آتی ہے وہ خدا کی طرف سے نہیں آتی' خود تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے۔ وہ یا تو تمہاری اپنی غلط تدبیر کا نتیجہ ہوتی ہے یا اس کا ذمہ دار معاشرہ کا غلط نظام ہوتا ہے۔ اگر وہ تمہاری اپنی غلط تدبیر کا نتیجہ ہے تو اس کی اصلاح خود کرو۔ اور اگر وہ غلط معاشرہ کا نتیجہ ہے تو اس معاشرہ کو الٹ کر اس کی جگہ صحیح معاشرہ قائم کرو۔ جو لوگ تم سے کہتے ہیں کہ یہ مصائب اور تکالیف' یہ تباہیاں اور بربادیاں خدا کی طرف سے آتی ہیں' وہ تمہیں دھوکا دے کر' تمہاری نگاہوں کا رخ دوسری طرف پھیر دیتے ہیں تاکہ تم انہیں ذمہ دار ٹھہرا کر ان کا مواخذہ نہ کرنے لگ جاؤ۔ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنۡ اَنۡفُسَهُمۡ یَظۡلِمُوۡنَ ﴿۱۱۷﴾ (3:117)۔ خدا کسی پر ظلم و زیادتی نہیں کرتا۔ انسان خود ہی اپنے آپ پر زیادتی کرتے ہیں۔ یاد رکھو! جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر خدا کو منظور نہ ہوتا تو ایسا کبھی نہ ہوتا' یہ غلط بیانی سے کام لیتے ہیں' یہ دھوکا دیتے ہیں۔ سَیَقُوۡلُ الَّذِیۡنَ اَشۡرَكُوۡا لَوۡ شَآءَ اللّٰهُ مَاۤ اَشۡرَكۡنَا وَلَاۤ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمۡنَا مِنۡ شَیۡءٍ ؕ (6:148)۔ یہ مشرکین کہیں گے کہ اگر خدا کو منظور نہ ہوتا تو ہم اور ہمارے آباؤ اجداد نہ خدا کے ساتھ کسی کو

شریک کرتے' نہ ہی از خود حلال چیزوں کو حرام قرار دیتے۔ ہم جو کچھ کرتے ہیں اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں' یہ سب خدا کی مشیت سے ہوتا ہے۔ انسان تو مجبورِ محض ہے' اس کی کیا مجال کہ خدا کے حکم کے بغیر کچھ کر سکے۔ اس کے جواب میں کہا۔ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (6:148)۔ یہ جھوٹ بولتے ہیں اور یہ کوئی نئی بات نہیں۔ اس سے پہلے بھی خود فریب قومیں اسی طرح تقدیر کے عقیدہ کو اپنی غلط کوشیوں کے لئے آڑ بنالیا کرتی تھیں لیکن اس سے خدا کا قانون مکافات تو نہیں بدل جاتا تھا۔ وہ لوگ اپنے غلط اقدامات کو مشیت خداوندی کی طرف منسوب کئے جاتے۔ حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا ؕ (6:148)۔ اور ان کے اعمال کے نتائج تباہیاں بن کر انہیں گھیر لیتے۔

رزق کی بست و کشاد:

آپ نے غور فرمایا! برادران گرامی قدر! کہ اس اعلان نے' انسانی فکر و نظر کی دنیا میں کیسا انقلاب عظیم برپا کر دیا؟ پھر آپ ﷺ نے لوگوں سے کہا کہ یہ جو تم سے کہا جاتا ہے کہ رزق کی تنگی اور خوش حالی کو خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے' وہ جسے چاہے کروڑ پتی بنا دے' جسے چاہے روٹی سے بھی محتاج کر دے' تو یہ بھی ان کا فریب ہے۔ یاد رکھو! رزق کی بست و کشاد کے لئے بھی خدا کے قوانین مقرر ہیں۔ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا (20:124)۔ جو ان قوانین سے اعراض برتتا ہے' تو اسکی روزی تنگ ہو جاتی ہے۔ اگر کسی معاشرہ میں حالت یہ ہے کہ لاکھوں انسان رات کو بھوکے سوتے ہیں' اور ان کے بچے دودھ کے گھونٹ کے لئے ترستے ہیں' تو یہ کچھ خدا کی مرضی سے نہیں ہوتا' وہ معاشرہ قوانین خداوندی سے سرکشی برتتا ہے جس کا نتیجہ اس قسم کی ناہمواریاں ہوتی ہیں۔ تم ان کی فریب آمیز باتوں میں نہ آؤ۔ اس معاشرہ کو بدل کر' ایسا معاشرہ قائم کرو جس میں رزق کی تقسیم اللہ کے قوانین کے مطابق ہو اور امیر اور غریب کی تفریق مٹ جائے۔ یاد رکھو! کوئی بچہ' نہ امیر پیدا ہوتا ہے نہ غریب۔ یہ تمہارا غلط نظام ہے جو اس قسم کی تفریق پیدا کرتا ہے۔

اور یہ جو بگلا بھگت تمہیں یہ کہہ کر تھپکیاں دیتے رہتے ہیں کہ اگر تم مفلس اور غریب ہو تو اس سے دل گرفتہ نہ ہو۔ خدا کے مقرب بندوں کی یہی نشانیاں ہیں تو یہ تمہیں سخت دھوکے میں رکھتے ہیں۔ یاد رکھو! ''خوف اور بھوک خدا کا عذاب ہے۔'' (16:112) اور یہ عذاب صرف اسی دنیا تک محدود نہیں۔ جس کی یہ دنیا خراب ہے۔۔ اور وہ اپنی اس خرابی کو خدا کی مشیت یا اس کے مقربین کی علامت سمجھ کر مطمئن ہو کر بیٹھ جاتا ہے' اس کی عاقبت بھی خراب ہوگی۔ میں نے جو آیت ابھی ابھی پیش کی ہے یعنی وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا۔ جو ہمارے قوانین سے اعراض برتے گا اس کی روزی تنگ ہو جائے گی۔۔ تو اس کا باقی حصہ یہ ہے کہ: وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى (20:124) ہم اسے قیامت کے دن بھی اندھا ہی اٹھائیں گے۔۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے خدا کے اس عظیم داعیٔ انقلاب ﷺ نے ان جامع الفاظ میں بیان فرمایا کہ: الفقر سواد الوجھه فی الدارین۔ مفلسی اور محتاجی' دنیا اور آخرت دونوں جہانوں میں روسیاہی کا باعث ہے۔ اور دوسری جگہ فرمایا کہ مفلسی اور محتاجی انسان کو کفر کی حد تک لے جاتی ہے۔

علماء ومشائخ:

وہ مذہبی پیشوا' جو مفاد پرست گروہوں کے ایجنٹ بن کر' عوام کو غلط عقائد کی افیون پلاتے رہتے ہیں' ان کے متعلق فرمایا کہ یاد رکھو! اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ (9:34) یہ جو علماء ومشائخ بڑے مقدس بنے پھرتے ہیں' ان میں سے اکثریت کی یہ حالت ہے کہ یہ لوگوں کا مال حرام طور پر کھا جاتے ہیں اور ہر وقت اس کوشش میں رہتے ہیں کہ یہ لوگ کہیں خدا کے صحیح نظام کو قائم نہ کر لیں اس لئے کہ صحیح نظام خداوندی میں ان کا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ باقی رہے وہ سرمایہ دار جن کے یہ ایجنٹ ہوتے ہیں تو سن رکھو کہ: وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ (9:34)۔ جو لوگ دولت کے ڈھیر جمع کرتے ہیں اور اسے ضرورتمندوں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے عام نہیں کرتے' ان سے کہہ دو کہ ان کی اس روش کا نتیجہ ایسی تباہی ہوگی جس سے وہ چیخ اٹھیں گے۔

حکومت:

غور فرمایا آپ نے عزیزان من! ایک خدا کے تصور میں صحیح تبدیلی پیدا کر دینے سے' حضور ﷺ نے کس طرح مذہبی پیشوائیت اور نظام سرمایہ داری کی انسانیت سوز لعنتوں کو جڑ سے کاٹ کر رکھ دیا۔ باقی رہا نظام حکومت' تو اس کے لئے آپ نے اعلان فرما دیا کہ:

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۙ (3:79)

کسی انسان کے لئے یہ جائز نہیں کہ خدا اسے ضابطۂ قوانین حکومت حتیٰ کہ نبوت تک بھی دے دے اور وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم قانون خداوندی کی نہیں بلکہ میری محکومی اختیار کرو۔ اسے صرف یہ کہنا چاہئے کہ اس ضابطۂ قوانین کی رو سے ربانی بن جاؤ جسے تم پڑھتے پڑھاتے ہو اور جس کی تعلیم کو تم اپنے دل پر نقش کرتے ہو۔

آپ نے غور فرمایا کہ اس ایک اعلان سے حضور ﷺ نے کس طرح حکومت کے تصور کو بنیادی طور پر بدل دیا۔۔۔ اعلان یہ ہے کہ کسی انسان کو اس کا حق ہی حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان پر اپنا حکم چلائے خواہ وہ نبی ہی کیوں نہ ہو۔ حکومت صرف قانون کی ہوگی اور قانون بھی وہ جو خدا کا عطا کردہ ہو' کسی انسان یا انسانوں کی جماعت کا وضع کردہ نہ ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ آپ ﷺ خود قریب دس لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی مملکت کے واحد حکمران تھے۔ لیکن حکمرانی میں کسی امتیازی شان کے پیدا نہ ہونے دینے کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ کسی نے آپ ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے کہہ دیا۔۔۔ سیدنا! اے ہمارے آقا۔۔۔ تو اس پر آپ نے ڈانٹ کر کہا کہ دیکھو! تمہیں شیطان بہکا رہا ہے۔ آقا صرف خدا کی ذات ہے۔ میں تو عبداللہ کا بیٹا محمد ﷺ' خدا کا بندہ اور اس کا رسول ﷺ ہوں۔ آقائیت صرف ذات خداوندی کے لئے ہے اور کسی

کے لئے نہیں۔

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

آپ ﷺ نے' مملکت کے ارباب بست وکشاد کے لئے حکام کے بجائے عمال کی اصطلاح رائج فرمائی جس کے معنی حکم چلانے والے نہیں بلکہ کام کرنے والے (کارندے) کے ہیں۔ان عمال کو تملق پیشہ مصاحبوں کے نرغے سے بچانے کے لئے آپ ﷺ نے یہاں تک فرمایا کہ اگر کسی شخص نے' حاکم کو خوش کرنے کے لئے ایسی بات کہہ دی جس سے اس کا خدا ناراض ہو جائے (یعنی وہ قانون خداوندی کے خلاف ہو) تو وہ اللہ کے دین سے نکل گیا۔

جس معاشرہ میں' ذاتی جائیدادیں بنانے کا تصور نہ ہو اس میں رشوت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔۔ یہ چیزیں تو نظام سرمایہ داری کی لعنتیں ہیں۔لیکن آپ ﷺ نے اس باب میں بھی اتنی دور نگہی اور جز رسی سے کام لیا کہ اس فتنہ کی جڑ کاٹ کر رکھ دی۔ پہلے تو یہ فرمایا کہ ''رشوت لینے والا اور رشوت دینے والا دونوں جہنمی ہیں''۔اس کے بعد' آپ ایک قدم اور آگے بڑھے۔اس نکتہ کو سمجھنے کے لئے' آپ یہ دیکھئے کہ آج کل تو رشوت' بالکل خرید وفروخت کے حساب سے کھلے بندوں لی اور دی جاتی ہے' لیکن جب اس کا چلن عام نہیں تھا تو لوگ حکام کے ہاں تحائف پہنچاتے تھے جسے ڈالی کہا جاتا تھا۔جس حاکم نے ڈالی رکھ لی۔سمجھ لیا کہ اسکا پانی مرتا ہے۔اس کے بعد آہستہ آہستہ تحائف سے رشوت تک پہنچ گئے۔حضور ﷺ نبی اکرم کی نگہ بصیرت اس فتنہ کے سرچشمہ کو بھانپ رہی تھی۔ایک مرتبہ ایک عامل نے آ کر کہا کہ یہ حکومت کے واجبات ہیں جو میں نے لوگوں سے وصول کئے ہیں اور یہ ایک تحفہ ہے جو انہوں نے مجھے ذاتی طور پر دیا ہے۔آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب تم عامل نہیں تھے اور اپنے گھر میں بیٹھے رہتے تھے تو کیا یہ لوگ اس وقت بھی تمہیں تحائف بھیجتے تھے۔انہوں نے نفی میں جواب دیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ پھر یہ تحفہ نہیں' رشوت ہے۔اسے بیت المال میں داخل کرو اور آئندہ کبھی تحائف قبول نہ کرو۔آپنے غور فرمایا' عزیزان من! کہ حضور ﷺ نے دوستداری کے ذاتی تعلقات اور سرکاری ملازموں کے ساتھ تعلقات میں کیسا لطیف لیکن نہایت عمیق خط امتیاز کھینچا ہے۔دوستوں سے تبادلۂ تحائف کی آپ نے ترغیب دلائی تھی کہ اس سے باہمی تعلقات میں خوشگواری پیدا ہوتی ہے لیکن جب کسی سرکاری ملازم کو تحفہ دیا جاتا ہے تو وہ دوستداری کے تعلقات کی بناء پر نہیں ہوتا۔وہ' اس سے تعلقات پیدا کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے تاکہ اس سے آگے چل کر کچھ مفاد حاصل کئے جائیں۔یہی ہیں وہ تحائف جو رشوت کا پیش خیمہ بن جاتے ہیں۔اس لئے آپ ﷺ نے ان سے بھی روک دیا۔

رسول کی حیثیت:

اب ہمارے سامنے' عزیزان من! اس مرحلہ کا نازک ترین گوشہ آتا ہے۔آپ دنیائے مذاہب پر ایک نظر ڈالئے۔ آپ دیکھیں گے کہ انہوں نے اپنے مذہب کے بانی کو انسانی سطح سے اٹھا کر' فوق البشر حیثیت دے دی۔کہیں اسے خدا کا اوتار بنایا گیا' کہیں خدا کا بیٹا' کہیں خود خدا۔لیکن حضور ﷺ نے اپنے متعلق اعلان فرما دیا۔۔اور ایک بار نہیں' بار بار یہ اعلان

کیا کہ: اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (18:110) سن رکھو کہ میری حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ میں خود تمہارے جیسا ایک انسان ہوں۔۔ مجھے خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے اور جب میں اس وحی کو تم تک پہنچا دیتا ہوں تو پھر مجھ میں اور تم میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ مجھے کوئی فوق الفطرت قوت حاصل نہیں۔ لَآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا (10:49) دوسرے تو ایک طرف، مجھے خود اپنی ذات کے لئے بھی کسی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں۔ میں غیب کی باتوں کو بھی نہیں جانتا۔ لَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ (11:31) تم مجھ سے معجزات طلب کرتے ہو کہ وہ اس بات کی شہادت بنیں کہ میں اپنے دعوائے رسالت میں سچا ہوں یا جھوٹا۔ سنو کہ میرا معجزہ کیا ہے۔

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (10:16)

میں نے اس سے پہلے اپنی ساری عمر تمہارے درمیان گذاری ہے۔ تم ذرا عقل وفکر سے کام لے کر سوچو کہ اس قسم کی زندگی کسی جھوٹے اور فریب کار کی ہوتی ہے یا سچے اور راستباز انسان کی؟

یہ ہے میرے دعویٰ کی صداقت کا ثبوت، اور میرا معجزہ۔۔۔ وہ معجزہ جو تم میں سے بھی ہر ایک دکھا سکتا ہے۔

ختم نبوت:

مذہب کی دنیا میں کسی رسول کا یہ اعلان ہی کچھ کم انقلاب انگیز نہ تھا کہ وہ اور انسانوں جیسا ایک انسان ہے، اور (وحی کے علاوہ) اس نے جو کچھ کر کے دکھایا ہے وہ ایک انسان کی حیثیت سے کیا ہے۔ اس لئے اسے، ہر وہ انسان کر کے دکھا سکتا ہے جو وحیٔ خداوندی کا اتباع کرے۔ لیکن آپ ﷺ ایک قدم اور آگے بڑھے اور ایک اعلان ایسا فرمایا جو اس سے پہلے نہ کہیں دیکھا تھا نہ سنا۔ اور جو مذہب کی دنیا میں بڑا ہی محیر العقول اور خارق عادت تھا اور وہ اعلان یہ تھا کہ اب نبوت کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔ اب کوئی آ کر یہ بات بھی نہیں کہہ سکے گا کہ مجھے خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے اس لئے تم میری وحی کا اتباع کرو۔ خدا کی طرف سے جو کچھ ملنا تھا وہ مل چکا اور اس کی کتاب میں محفوظ کر دیا گیا۔ اب دنیا کے کسی انسان کے لئے اتنی سی فوق الفطرت خصوصیت کی گنجائش بھی نہ رہی کہ اسے خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے۔۔۔ نہ ہی کسی انسان کے لئے اس کا حق باقی رہا کہ وہ دوسرے انسانوں سے اپنی بات خدا کی وحی کہہ کر منوائے۔ اس سے انسان کو کس قدر فکری اور قلبی آزادی نصیب ہوتی ہے، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔۔۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے اقبالؔ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

اسلام کا بنیادی تخیل یہ ہے کہ اب وحی کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اس بنا پر ہمیں دنیا کی سب سے زیادہ آزاد قوم ہونا چاہئے۔ پہلے زمانے کے مسلمان، جو ایشیائے قبل از اسلام کی غلامی سے (نئے نئے) آزاد ہوئے تھے، اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ (ختم نبوت) کے اس بنیادی تخیل کی اہمیت کا صحیح صحیح اندازہ کر سکتے۔ لیکن دور حاضر کے مسلمان کو چاہئے کہ وہ اپنی پوزیشن کو اچھی طرح سے سمجھے اور (قرآن کے) غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں اپنے معاشرہ کی تشکیل جدید کرے اور وہ عالمگیر جمہوریت قائم کر کے دکھا دے جو اسلام کی اصل وغایت ہے لیکن جو ابھی تک پورے طور پر بے نقاب ہو کر دنیا کے سامنے نہیں آئی۔

(خطباتِ اقبالؔ)

خدا کی طرف سے مکمل راہنمائی اس کی کتاب کے اندر محفوظ شکل میں موجود ہے۔ اب مسلمانوں کا کام یہ ہے کہ وہ اس راہنمائی کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے' اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کا حل' باہمی مشاورت سے' غور وفکر اور علم و بصیرت کی رو سے تلاش کریں۔ اب لوگوں کو کسی خاص شخصیت کی طرف آنکھیں لگا کر بیٹھنے کی ضرورت نہیں کہ جو فیصلہ وہاں سے ملے اس پر عمل کیا جائے۔ اب شخصیتوں کا دور ختم ہو گیا' اور اسے ختم یہ کہہ کر کیا گیا کہ کائنات کی عظیم ترین شخصیت خود محمد ﷺ رسول اللہ کی ہے۔ لیکن سن رکھو کہ۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاْئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ (3:144)

محمد ﷺ بھی اس کے سوا کچھ نہیں' کہ خدا کے ایک پیغام بر ہیں۔ ان سے پہلے بھی خدا کے پیغام بر' اپنی اپنی باری آئے اور دنیا سے چلے گئے۔ سو کیا جب یہ کل کو مر جائیں' یا قتل کر دیئے جائیں تو تم (یہ کہہ کر) الٹے پاؤں لوٹ جاؤ گے (کہ بات تو ساری محمد ﷺ کی ذات سے تھی۔ جب وہ نہیں رہے تو معاملہ ختم ہو گیا)۔

عقل کا مقام:

نہیں! اب بات شخصیتوں پر منحصر نہیں رہی۔ اب دور اصولوں کی حکمرانی کا آ گیا ہے۔ وحی کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں عقل کی آنکھ سے کام لینا' یہ ہے ختم نبوت کا عملی مفہوم۔ اور یہاں سے ہمارے سامنے ایک اور عظیم انقلاب کا اشارہ سامنے آتا ہے۔ ''مذہب میں عقل کا دخل نہیں''۔ اسے دنیا کے ہر مذہب میں بطور مسلمہ تسلیم کیا جاتا تھا (اور کیا جاتا ہے) حضور نبی اکرم ﷺ نے بتایا کہ انسانی زندگی میں عقل کو بڑا بلند مقام حاصل ہے۔ جو کچھ میں عرض کرنے لگا ہوں اسے' برادران عزیز! غور سے سنئے گا۔

حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ وہ حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اے اُمّ المومنین! ایک شخص رات کو زیادہ سوتا ہے اور کم عبادت کرتا ہے اور دوسرا زیادہ عبادت کرتا ہے اور کم سوتا ہے۔ آپ کے نزدیک دونوں میں سے کونسا زیادہ پسندیدہ ہے۔

حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ ایک دفعہ میں نے ایسا ہی سوال رسول ﷺ اللہ سے کیا تھا تو آپ ﷺ نے جواب دیا تھا کہ ان میں سے جو زیادہ عقلمند ہے وہ۔ میں نے عرض کیا۔ یارسولؐ اللہ! میں نے تو ان کی عبادت کے متعلق پوچھا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ اے عائشہؓ! ان کی عقلوں کے متعلق سوال ہوگا۔ پھر جو شخص زیادہ عقلمند ہوگا وہی دنیا اور آخرت میں افضل ہوگا۔ (کتاب الازکیا۔ ابن جوزی)۔

میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں' عزیزان من! کیا مذہب کے سارے لٹریچر میں آپ کو کہیں اور بھی اس قسم کا انقلاب انگیز اعلان ملتا ہے؟ یا اس قسم کا اعلان کہ:

مسلمانوں میں کامل ایمان اس کا ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہیں۔ (ترمذی)۔ (جاری ہے)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خصوصی درس:

فَقُلۡنَا اضۡرِبُوۡہُ بِبَعۡضِہَا ؕ (2:73)

صاحبِ درس

صاحبِ درس شیخ اللہ دتا جو بزمِ طلوعِ اسلام میں سراج منیر کے قلمی نام سے متعارف رہے ہیں، اس وقت 80 ویں سال کے پیٹے میں ہیں۔ موصوف علمی میدان میں فاضلِ عربی۔ ایم اے اسلامیات، اردو ادب میں بھی فاضل اور ایم اے اور ایل ایل بی ہیں۔ عملی زندگی میں پنجاب سول سیکریٹریٹ کی سروس سے بطور سیکریٹری ٹو گورنمنٹ سال 2000ء میں ریٹائر ہوئے۔ بعد ازاں لیگل پریکٹس شروع کی اور اب ایڈووکیٹ ہائی کورٹ ہیں۔

انہوں نے اپنے ہفتہ وار درس قرآن کریم کا آغاز جنوری 1964ء میں بزمِ طلوعِ اسلام ملتان کے حلقۂ سماعت سے کیا اور ملتان جیسے مذہبی شہر میں مئی 1965ء تک کھلا درس دیتے رہے۔ اس کے بعد وہاں علامہ پرویزؒ صاحب کا درس بذریعہ ٹیپ ریکارڈ شروع ہو گیا۔

شیخ صاحب بزمِ طلوعِ اسلام پنج کسی (حال ضلع خانیوال) کے دسمبر 1957ء میں رکن بنے اور یہ وابستگی قائم ہے۔ 1973ء میں بسلسلہ ملازمت لاہور آنے کے بعد سے محترم پرویزؒ صاحب کا درس باقاعدگی سے اکتوبر 1984ء تک سنا اور بزمِ طلوعِ اسلام لاہور میں بھی اپنے فرائض ادا کرتے رہے۔

علامہ پرویزؒ کی وفات کے بعد انہوں نے احباب کے تقاضا پر اپنا درسِ قرآن 1994ء میں دوبارہ شروع کیا جو پہلے ان کی رہائش گاہ بہاولپور ہاؤس، پھر سرسید میموریل لائبریری باغبانپورہ لاہور باہتمام ڈاکٹر محمد سعید اور 2006ء سے کسان ہال مزنگ روڈ، لاہور پر ہوتا چلا آ رہا ہے۔

زیرِ نظر درس اگرچہ ابتداء میں ہی ہو گیا تھا لیکن اس کی اہمیت کے پیشِ نظر، احباب کے تقاضا پر پھر اسے حال ہی میں دہرایا گیا۔ جس کا ریکارڈ ان کے ملاحظہ کے بعد قارئین کے استفادہ کے لئے پیش کیا جا رہا ہے۔

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
www.azharabbas.com
khawaja.azharabbas@gmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآن کریم انسانوں کو قانون سازی کی اجازت کیوں نہیں دیتا

مشہور اخبار ''دی نیوز'' کی اشاعت مورخہ 12، اپریل 2018ء میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ سابق چیف جسٹس آف پاکستان، جناب ثاقب نثار صاحب نے کوئٹہ رجسٹری میں، 11 اپریل 2018ء کو ایک جامع تقریر فرمائی ہے جس میں انہوں نے عدالتوں کی کارکردگی کو غیر اطمینان بخش قرار دیا ہے۔ یہ سابق چیف جسٹس صاحب کی عالی ظرفی تھی کہ انہوں نے اس بات کا اعتراف فرمایا کہ ججوں کو تمام سہولتیں ملنے کے باوجود نتائج اطمینان کے قابل نہیں آرہے ہیں۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ سب سے پہلے وہ عدالتوں کا نظام درست کریں گے، پھر وہ اس کے نتائج پر غور کریں گے۔ پاکستان کے ہر شخص کو اس بات کا علم ہے کہ ہمارے ہاں شروع سے ہی، جب سے پاکستان معرض وجود میں آیا ہے ہماری عدالتیں آزاد نہیں رہی ہیں یہ صرف اس دور کی خوش بختی ہے کہ اس وقت ہماری عدالتیں آزاد بھی ہیں اور جرأت مند بھی ہیں۔ جناب سابق چیف جسٹس صاحب نے عدالتوں کی جن خامیوں کی طرف نشاندہی کی تھی وہ بیشک درست ہیں۔ لیکن اگر کسی ملک کا نظام مملکت، اور اس ملک کا قانون ہی غلط ہو، تو اس ملک میں انصاف کس طرح فراہم ہوسکتا ہے کسی ملک کے قوانین اس ملک کے نظام کی معرفت سے ہی وضع کئے جاتے ہیں۔ ہمارے ملک میں نظامِ جمہوریت رائج ہے۔ ہماری حکمران جماعت اور سیاستدان جو قانون اپنے مفاد کی خاطر وضع کرتے ہیں وہ سب قوانین جمہوریت کی بقا اور اس کے استحکام کے نام پر بنائے جاتے ہیں۔ سابق چیف جسٹس صاحب کی ہزار کوششوں کے باوجود مغربی جمہوریت کے جو نقائص و معائب ہیں، اور اس کے جو تباہ کن نتائج برآمد ہوتے ہیں، سابق چیف جسٹس صاحب ان نتائج سے ملک کو محفوظ نہیں رکھ سکے۔

نظامِ جمہوریت کی، اور دیگر تمام سیکولر نظاموں کی سب سے بڑی خامی و کمزوری یہ ہے کہ ان نظاموں کی کوئی بنیاد یا اساس نہیں ہوتی۔ کمیونزم ایک اچھا، نظام تھا، لیکن اس کی کوئی بنیاد نہیں تھی کہ کوئی انسان اپنا کمایا ہوا پیسہ دوسروں پر کیوں خرچ

کرے، اسی بنیاد کے نہ ہونے کی وجہ سے وہ ناکام ہوگیا۔ کمیونزم کے متعلق ہی علامہ اقبال کا وہ مشہور شعر ہے جس میں انہوں نے فرمایا ؎

اے کہ می خواہی نظامِ عالمے جستہ ای او را اساس محکمے؟

ترجمہ: اے وہ شخص کہ جو دنیا میں ایک نظام قائم کرنا چاہتے ہو، کیا تم نے اس نظام کی بنیاد تلاش کر لی ہے؟ لیکن یہ تو عقل انسانی کی عاجزی ہے کہ وہ کسی بھی نظام کی اساس تلاش نہیں کر سکتی۔ کسی بھی نظام کی اساس طے کرنا عقلِ انسانی کے دائرہ سے باہر ہے۔ اسی لئے مغربی جمہوری نظام بھی ناقص اور بدترین نظام ہے۔ یہ صرف وحی الٰہی ہی ہے جو اپنے نظام کی اساس مہیا کرتی ہے اور اسی اساس پر اپنے نظام کو قائم کرتی ہے۔ ہم اس کا تفصیلی ذکر اس مضمون میں آگے کریں گے۔

(2) جمہوریت کی دوسری خامی یہ ہے کہ عقل انسانی Good and Evil یعنی خیر و شر کو Define ہی نہیں کر سکتی (2:216) مغرب کے فلاسفر اور دانشوروں نے خیر و شر کے تعین کی بہت کوشش کی، لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکے، اور قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ وہ اس کام میں آئندہ بھی کبھی کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ جب وہ اس کوشش میں ناکام ہو گئے تو انہوں نے کہا کہ خیر و شر کا مسئلہ عقل انسانی سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھتا، اس کا تو لوگوں کے جذبات سے تعلق ہے۔ لیکن چونکہ جذبات تو ہر شخص کے انفرادی ہوتے ہیں، اس لئے مغرب میں خیر و شر کا تصور بھی انفرادی ہے۔ خیر و شر کے انفرادی معیار ہونے کی وجہ سے اخلاقیات کی کوئی بنیاد نہیں رہتی اور یہ ساری اخلاقیات Relative بن جاتی ہے۔ مغربی فکر کے نزدیک اخلاقی شعور کوئی چیز نہیں ہے۔ بچے کو جو کچھ اس کے معاشرے میں سکھا دیا جاتا ہے، وہ ہی اس کا معیارِ اخلاق بن جاتا ہے۔ ان کے ہاں اخلاق سوسائٹی کی پیداوار ہوتا ہے، اس میں Objectvity نہیں ہوتی اور ان کا معیار عقلِ انسانی ہوتی ہے۔ جمہوریت میں چونکہ اخلاق کا معیار انفرادی ہوتا ہے اس لئے سیاستدانوں اور حکمرانوں میں اخلاقیات نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ وہ اپنے، اپنی پارٹی، اپنے وطن کے مفادات کے علاوہ انسانیت کے مفادات کو سامنے رکھ ہی نہیں سکتے۔ عراق، شام، فلسطین، کشمیر اور بوسنیا کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ آج ساری دنیا میں اس وجہ سے فساد ہی فساد ہے۔ جو سیاستدانوں کے اپنے کرتوتوں کی وجہ سے ہوا ہے۔ قرآنِ کریم خیر و شر میں بڑا واضح امتیاز کرتا ہے۔ جس کی وضاحت ہم آئندہ اسی مضمون میں کریں گے۔ خیر و شر کے تعین کے بعد قرآنِ کریم بلند آواز میں یہ دعویٰ کرتا ہے کہ: وَاَمَّا مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ ؕ (13:17) ترجمہ: اور جس چیز سے لوگوں کو نفع پہنچتا ہے وہ زمین میں ٹھہری رہتی ہے۔ جو کچھ تم صرف اپنی ذات کے لئے کرتے ہو وہ تمہاری ذات کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ جو کچھ تم پوری انسانیت کے فائدے کے لئے کرتے ہو وہ باقی رہتا ہے۔

(3) جمہوریت میں اقتدار اعلیٰ عوام کا ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں ہر وقت عوام کی عدالت کا چرچا ہوتا ہے اس کی مثال اس طرح ہے جیسے میڈیکل سائنس کے کسی اہم سوال کے بارے میں عوام کی کثرتِ رائے سے فیصلہ کر لیا جائے اور اس میں کسی

ایک ڈاکٹر کی بھی رائے کے لی جائے حکومت جیسے اہم فریضہ کو عوام کے سپرد کرنا بہت بڑی نادانی کی بات ہے۔ حکومت چلانا ایک مشکل کام ہے۔ ہر شخص حکومت نہیں چلا سکتا۔ قرآن کریم نے ارشاد فرمایا کہ اس کو ملک کے بہترین اور اہل لوگوں کے سپرد کرنا چاہئے تاکہ وہ اپنی عقل وفکر کے ذریعے عوام کی سطح کو بلند کرتے چلے جائیں اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُکُمۡ اَنۡ تُؤَدُّوا الۡاَمٰنٰتِ اِلٰۤی اَہۡلِہَا ۙ (4:58) اس کا ترجمہ عموماً یہ کیا جاتا ہے کہ اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں امانت والوں کو واپس دیدو۔ یعنی اگر کوئی شخص تمہارے پاس کوئی امانت رکھے تو اس کو عندالطلب اُسے واپس کردو۔ اگرچہ یہ بات بھی درست ہے۔ لیکن یہ بات پوری نہیں ہے۔ درسی ''لغات''، ''مصباح اللغات'' میں امانت کا ترجمہ فریضہ خداوندی لکھا ہے اپنے اختیارات اور اقتدارات ان لوگوں کے سپرد کرو جو اس کے اہل ہوں۔ اس موجودہ نظامِ جمہوریت میں جب ہم اپنا ووٹ کسی کو دیتے ہیں تو وہ اپنا اختیار دوسرے کے سپرد کرتے ہیں کہ میری طرف سے تم وہاں وہ بات کرو جو میرے مفاد میں ہے۔ جمہوریت میں یہ نقص ہے کہ آپ جب بھی اپنے اختیارات دوسرے کے سپرد کردیتے ہیں۔ یعنی اپنا ووٹ کسی کو دے دیتے ہیں۔ وہ آپ کا مفاد پیش نظر نہیں رکھتا۔ وہ اپنا مفاد پیشِ نظر رکھتا ہے لیکن آپ 5 سال کے لئے اپنے ہاتھ کٹوا کر اس کے محتاج ہوجاتے ہیں۔

مغربی جمہوریت کا تیسرا عیب یہ ہے کہ اس میں کوئی غریب آدمی حصہ نہیں لے سکتا۔ جمہوریت کا نظام الیکشن کے ذریعے چلتا ہے اور الیکشن میں کوئی غریب آدمی حصہ لے ہی نہیں سکتا۔ اس میں کروڑوں اور اربوں روپے خرچ کرکے ووٹوں کی خرید وفروخت ہوتی ہے۔ جس کے پاس دولت ہوتی ہے وہ ہی ممبر بن سکتا ہے۔ خواہ وہ اس عہدہ کے لئے کتنا ہی نااہل کیوں نہ ہو۔

(4) جمہوریت کا چوتھا عیب یہ ہے کہ اس میں قوانین کی اطاعت کی بجائے انسانوں کی اطات کی جاتی ہے۔ قرآنِ کریم کی رُو سے انسان کی حکومت، دوسرے انسان پر بالکل حرام ہے (3:79، 12:40، 5:50)، جو انسان دوسرے انسان کی بخوشی اطاعت کرتا ہے اور اس کی محکومیت اختیار کرتا ہے وہ شخص بے شرم اور بے غیرت ہوتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا کہ اس معاملے میں انسان کتے سے بھی زیادہ بے شرم ہے کہ ''من نہ دیدم کہ سگے پیش سگے سرخم کرد'' میں نے نہیں دیکھا کہ کوئی کتا دوسرے کتے کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہو۔ بے غیرتی اور بے شرمی کے علاوہ وہ معصیت خداوندی کا بھی مرتکب ہوتا ہے۔

(5) سورۂ مائدہ میں ارشاد ہے: لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ ﴿۴۴﴾ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۴۵﴾ الۡفٰسِقُوۡنَ ﴿۴۷﴾ (5:44-45-47)، ترجمہ جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہ کافر، ظالم اور فاسق ہیں۔ ان تینوں آیات کی تفسیر کے ذیل میں مولانا مودودی مرحوم نے اپنی تفسیر میں تحریر فرمایا ہے ''یہاں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے حق میں جو خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں تین حکم ثابت کئے ہیں ایک یہ کہ وہ کافر ہیں دوسرے یہ کہ وہ ظالم ہیں اور تیسرے یہ کہ وہ فاسق ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو انسان خدا کے حکم اور اس کے نازل کردہ قانون کو چھوڑ کر اپنے یا دوسرے انسان کے بنائے ہوئے قوانین پر فیصلہ کرتا ہے وہ دراصل تین بڑے جرائم کا ارتکاب کرتا ہے۔ اوّلاً اس کا یہ فعل حکمِ

خداوندی کے انکار کا ہم معنی ہے اور یہ کفر ہے۔ ثانیاً اس کا یہ فعل عدل وانصاف کے خلاف ہے کیونکہ ٹھیک ٹھیک عدل کے مطابق جو حکم ہوسکتا تھا وہ تو خدا نے دے دیا تھا۔ اس لئے جب خدا کے حکم سے ہٹ کر اس نے فیصلہ کیا تو ظلم کیا۔ تیسرے یہ کہ بندہ ہونے کے باوجود جب اس نے اپنے مالک کے قانون سے منحرف ہوکر اپنا یا کسی دوسرے کا قانون نافذ کیا تو درحقیقت بندگی واطاعت کے دائرے سے باہر قدم نکالا، اور یہی فسق ہے۔ یہ کفر، ظلم، اور فسق اپنی نوعیت کے اعتبار سے لازماً انحراف از حکم خداوندی کی عین حقیقت میں داخل ہیں۔ ممکن نہیں ہے کہ جہاں وہ انحراف موجود ہو وہاں یہ تینوں چیزیں موجود نہ ہوں۔

جمہوریت کا پانچواں عیب یہ ہے کہ اس میں ایک بڑی اقلیت کو اکثریت کا محکوم رہنا پڑتا ہے۔

مغربی جمہوریت کا چھٹا عیب یہ ہے کہ اس کا لازمی نتیجہ سرمایہ داری ہوتا ہے اور اسی کا ایک شاخسانہ پانامہ لیکس (Leaks) ہے۔ زیر بحث یہ بات ہے کہ اربوں پاؤنڈ کی رقوم پاکستان سے باہر جائز طور پر گئی ہیں یا ناجائز طور پر گئی ہیں۔ حالانکہ اصل بات اعتراض کی یہ ہے پاکستان جیسے غریب ملک میں لوگوں کو جھونپڑی نصیب نہیں اس غریب ملک کے لیڈروں اور حکمرانوں کو یہ بات مناسب ہی نہیں کہ وہ اتنے قیمتی مکانات خرید کریں۔ لیکن یہاں کوئی اس اخلاقی نکتہ کو اٹھا ہی نہیں رہا یہاں یہ بحث ہے کہ رقوم قوانین کے مطابق گئیں یا نہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ قانون سازی کا اختیار اُنہیں حاصل ہے اگر وہ رقوم خلاف قانون گئیں تو یہ خود اس کو قانون کے دائرے میں لے آئیں گے۔ لیکن اصل اخلاقی اعتراض یہ ہے کہ غریب لوگوں کے نمائندوں اور ان کے ہمدروں کو اتنے فلیٹ خریدنے نہیں چاہئیں۔ جمہوریت کے برعکس وبرخلاف قرآن کے نظام میں یہ حکم ہے: وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۙ قُلِ الْعَفْوَ ؕ (2:219) ترجمہ: تجھ سے پوچھتے ہیں کیا خرچ کریں، ان سے کہہ دو ضرورت سے زیادہ جو کچھ بھی ہے دوسروں پر خرچ کردو۔ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۝ (53:39)، ترجمہ انسان کے لئے صرف وہ جائز ہے جو اس نے خود اپنی محنت سے کمایا ہو۔ اور یہ دونوں حکم وہ ہیں جنہیں کوئی انسان بدل نہیں سکتا۔ قرآن میں تو دولت جمع کرنے کی اجازت ہی نہیں ہے۔ سارے قرآن میں ایک آیت بھی ایسی نہیں ہے جس میں دولت جمع کرنے کی اجازت دی گئی ہو۔

(7) جمہوریت کا ساتواں بڑا عیب یہ ہے کہ قرآن کریم نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے (30:31) اور مختلف آیات میں فرمایا ہے کہ فرقہ بندی کرنے والوں کا نہ رسول اللہ ﷺ سے کوئی تعلق رہتا ہے (6:160) اور نہ خدا سے۔ فرقہ بندی کرنے والوں کے لئے دنیاوی زندگی میں ذلت وخواری کا عذاب ہوتا ہے (20:134) بھوک اور خوف کا عذاب ہوتا ہے (101:112) برکات سماوی وارضی کے لئے دروازوں کے بند ہوجانے کا عذاب ہوتا ہے (7:96)۔ قرآن کریم کی رُو سے دین اور سیاست ایک ہی چیز ہوتی ہے ان کے مابین کوئی تفریق نہیں ہوتی، اس لئے نظامِ جمہوریت پر اور اُن سب جمہوری پارٹیوں پر ان آیات کا اطلاق اسی طرح ہوتا ہے جس طرح دین اور دینی اداروں پر ہوتا ہے مغربی نظامِ جمہوریت کی اساس وبنیاد شرک پر قائم ہوتی ہے۔ اور نظام جمہوریت اور یہ تمام پارٹیاں ان عذاب کی مستحق ہیں جن کا حوالہ ہم نے ان

آیات میں دیا ہے۔

(8) جمہوریت کا آٹھواں عیب یہ ہے کہ اس نظام میں صدرِ مملکت کو immunity حاصل ہوتی ہے صدرِ مملکت سے اگر دورانِ صدارت کوئی غلطی یا جرم سرزد ہوتا ہے تو اس کی صدارت کے دوران اس کی کوئی گرفت نہیں ہوسکتی۔ مدینہ منورہ میں حضور ﷺ نے اسلامی مملکت قائم فرمائی۔ اس مملکت کے صدر خود حضور ﷺ تھے، ان کی ذمہ داریوں کے مطابق قرآن کہتا ہے اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ (17:75) اگر تم سے کوئی غلطی سرزد ہوئی تو ہم تم کو زندگی اور موت دونوں میں دُگنا عذاب دیں گے۔ یہ دوگنے عذاب کی دھمکی رسول اللہ ﷺ کے درجے اور مرتبے کے اعتبار سے تھی۔ جن کے رتبے جتنے بلند ہوتے ہیں اسی اعتبار سے ان کی ذمہ داریاں اونچی ہوتی ہیں اور اسی اعتبار سے ان کی سزا بھی زیادہ ہوتی ہے۔ حضور ﷺ تمام شہریوں سے زیادہ قوانین کا اتباع کرتے تھے (39:12) نظامِ جمہوریت میں صدرِ مملکت کو استثنیٰ دینا قرآن کے خلاف ہے۔ اس کو دوگنی سزا دینی چاہئے۔

اسی طرح صدرِ مملکت کی بیوی، First Lady کو بھی دوہری سزا دینے کا حکم قرآن میں آیا ہے۔ ارشاد عالیٰ يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ؕ (33:30) ترجمہ: اے نبی کی بیویو تم میں سے جو کوئی بے حیائی کا کام کرے گا اس کو دوہرا عذاب ہوگا۔ تم میں سے اگر کسی سے ناپسندیدہ حرکت سرزد ہوئی تو یاد رکھئے عام عورتوں کو جو سزا ملے گی، تمہیں اس سے دُگنی سزا ملے گی۔ حضرت عمرؓ جب اپنی مملکت میں کوئی قانون نافذ کرتے تھے تو پہلے اپنے گھر آکر کہتے تھے کہ یہ قانون کل سے نافذ ہوگا۔ تم آج سے ہی اس کے مطابق گھر میں عمل شروع کردو۔ اس لئے کہ آپ عام عورتوں جیسی عورتیں نہیں ہیں۔ آپ پر مملکت کی اطاعت کرنا دوسری عورتوں سے زیادہ ضروری اور لازمی ہے۔

اب ہم آپ کو اسلامی نظام کی اساس و بنیاد بتاتے ہیں اور آپ یہ غور فرمائیں کہ یہ بنیاد کس درجہ مضبوط ہے۔ اس کے بعد خیر و شر کے مسئلے کا حل پیش خدمتِ عالی کیا جائے گا۔

زندگی The Life ہزاروں، لاکھوں سال میں آہستہ آہستہ ترقی کرتی ہوئی حیوانیت کی سطح پر پہنچی۔ زندگی جب حیوانیت کی سطح سے آگے بڑھی اور اس کو اگلی منزل میں داخل ہونا ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی طرف سے ایک توانائی Energy ایک صلاحیت عطا فرمائی جس کو قرآنِ کریم نے روح کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ یہ توانائی جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوتی ہے تو یہ روح کہلاتی ہے۔ اور جب یہ توانائی نوعِ انسانی کو چلتی ہے تو قرآنِ کریم اس کو نفس کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ توانائی تو ایک ہی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ جب یہ توانائی انسانیت کو بہ حیثیت ایک نوع مجموعی طور پر ملتی ہے تو نفس کے لفظ سے پکاری جاتی ہے اور یہ توانائی ہی انسانیت کو حیوانیت سے ممیز کرتی ہے۔ عام طور پر لوگ انسان کو ''جسم اور روح'' کا مرکب سمجھتے ہیں لیکن قرآن کریم انسان کو ''جسم اور نفس'' پر مشتمل قرار دیتا ہے۔ یہی انسان کی ذات کہی جاتی ہے۔ نفس یا

ذات کو Define نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ یہ کوئی مادی چیز نہیں ہے۔ اس ذاتِ انسانی کو نشوونما دینا انسان کی زندگی کا فریضہ ہے جو شخص اس کو پوری طرح نشوونما دے گا، وہ انسانی جسم کی موت کے بعد بھی زندہ رہے گا اور مرنے کے بعد اگلی نوع میں ترقی کرتا جائے گا۔ یہی انسان کا جنت میں جانا کہلاتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس کی نشوونما نہیں کرے گا وہ اسی مقام پر رُکا رہے گا اور یہ اس کا جہنم میں رہنا ہوگا۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اس وقت فکری طور پر دنیا میں دو نظریہ ہائے حیات رائج ہیں۔ ایک تصورِ حیات یہ ہے کہ انسانی زندگی صرف یہ طبعی زندگی ہے۔ انسان یہ زندگی طبعی قوانین کے مطابق بسر کرتا ہے۔ اس جسم کی پرورش ان طبعی قوانین کے مطابق ہوتی رہتی ہے۔ جب کسی شخص کو موت آتی ہے تو اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ یہ نظریہ آج بھی رائج ہے اور یہ نظریہ نزولِ قرآن کے وقت بھی موجود تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ (45:24) ترجمہ: کہتے ہیں کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے۔ ہم طبعی قوانین کے مطابق مرتے اور جیتے ہیں اور وقت ہی ہمیں ہلاک کر دیتا ہے۔ قرآن کریم اس زندگی کو حیوانی سطح کی زندگی گردانتا ہے۔ یہ مادی نظریۂ حیات کہا جاتا ہے۔ آج کل زیادہ ممالک خصوصاً مغرب میں یہی تصورِ حیات رائج ہے۔

دوسرا تصورِ حیات وہ ہے جس کا ذکر ہم نے ابھی کیا ہے اس تصورِ حیات کا قائل ''نفس انسانی'' پہ یقین رکھتا ہے۔ مرنے کے بعد ذاتِ انسانی کے زندہ رہنے اور اگلی نوع میں ترقی کرنے کا قائل ہے۔

جمہوری نظام میں چونکہ انسانی ذات کا تصور نہیں ہوتا اس لئے اس کے سامنے صرف جسم کی پرورش ہوتی ہے۔ جس کے سامنے رزق کی فراہمی ضروری ہوتی ہے۔ مملکت میں بہترین Law and order ہونا ضروری ہوتا ہے۔ تعلیم اور علاج کی سہولتیں مہیا ہوتی ہیں۔ اس مملکت کے سامنے یہ مقاصد ہوتے ہیں اور مملکت مقصود بالذات ہوتی ہے آپ ایک مملکت میں یہ چیزیں فراہم کر دیں، ریاست کا مقصد پورا ہو گیا۔ لیکن اسلامی مملکت میں صرف جسم کی ضروریات سامنے نہیں ہوتی بلکہ اسلامی ریاست کا مقصد ذات کو فروغ دینا ہوتا ہے۔ اسلامی ریاست کا اصل مقصود ہی ذات کی پرورش کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے اسلامی ریاست مقصود بالذات نہیں ہوتی، یہ مقصود بالغیر ہوتی ہے اور وہ غیر ذات انسانی کی پرورش ہے جس سے یہ ذات ارتقاء کی منازل طے کرتی چلی جاتی ہے۔

جسم کی پرروش طبعی قوانین کے ذریعے ہوتی ہے۔ لیکن ذات انسانی چونکہ مادی چیز نہیں ہے اس لئے اس کی پروش میں طبعی قوانین کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ انسانی ذات کی پرورش قوانینِ خداوندی کے اتباع سے ہوتی ہے۔ وہ انسانوں کے اپنے وضع کردہ قوانین کے ذریعے نہیں ہو سکتی۔ یہ وہ مقام ہے جہاں انسانیت وحی الٰہی کی محتاج ہوتی ہے۔ ارشادِ عالی ہے: اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ (4:49) کیا تم نے ان لوگوں کی طرف نہیں دیکھا جو سمجھتے ہیں کہ ان کا نفس مزکی ہوتا جا رہا

ہے۔ بَلِ اللّٰہُ یُزَکِّیۡ مَنۡ یَّشَآءُ وَلَا یُظۡلَمُوۡنَ فَتِیۡلًا (4:49) یاد رکھو انسانی ذات کی نشوونما قوانینِ خداوندی کے مطابق ہوتی ہے۔ جنہیں اس نے اپنی مشیت کے مطابق بذریعہ وحی عطا کیا ہے۔ جو شخص بھی اپنی ذات کی نشوونما چاہتا ہے تو ان قوانینِ خداوندی کا اتباع کرے گا، تو اسے نشوونما حاصل ہوگا اور اس کی کوششوں کے نتائج میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں ہوگی۔

تجدید یادداشت کے لئے عرض ہے کہ قرآن کریم نفس انسانی یا ذاتِ انسانی کی نشوونما کو انسانی زندگی کا مقصد قرار دیتا ہے۔ یہ نفس جس قدر ترقی کرے گی، اسی قدر یہ مضبوط بھی ہوگی۔ یہ انسان کی موت کے بعد زندہ رہے گی اور بلند سے بلند مراتب ومناصب حاصل کرتی چلی جائے گی۔ قرآنِ کریم اس نفسِ انسانی کو اسلامی مملکت کی اساس قرار دیتا ہے۔ نفسِ انسانی کی پرورش کے قرآنِ کریم نے چار طریقے بتائے ہیں۔ ہم ان چار طریقوں کی تفصیل آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

(1) پہلا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قوانین کی اطاعت سے ذات انسانی کی اطاعت سے ذات انسانی کی نشوونما ہوتی ہے فرمایا: لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَہَا ؕ (2:286) خدا جو تم پر قوانین کی اطاعت فرض کر رہا ہے تو اس سے تمہاری نفس میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے لئے مزید فرمایا: لَہَا مَا کَسَبَتۡ وَعَلَیۡہَا مَا اکۡتَسَبَتۡ ؕ (2:286) ذات کی وسعت اور ترقی کے لئے قرآن کا یہ قانون ہے کہ نفس جس غلط کام کا ارتکاب کرتی ہے، اس سے اس کو نقصان ہوتا ہے۔ اور جو صحیح کام کرتی ہے اس سے اس کا فائدہ ہوتا ہے۔ یہ عربی گرائمر کا ایک باریک نکتہ ہے کہ عربی میں لَھَا کا جو ''لام'' آتا ہے وہ فائدہ کے لئے ہوتا ہے اور لام نافع کہلاتا ہے۔ اور علیھا میں جو لام آتا ہے وہ نقصان کے مفہوم میں آتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے قوانین کی اطاعت صرف اسلامی نظام میں ہوسکتی ہے اور اسلامی مملکت کا ہر شہری اپنے نفس کو نشوونما دینے کے لئے قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرتا ہے۔ اس اطاعت سے مملکت کا کاروبار بھی درست ہوتا ہے۔ اسلامی مملکت میں جب ایک آدمی کار چلاتا ہے تو وہ ٹریفک سگنل کی اطاعت کرتا ہے کیونکہ اس ریاست میں قوانینِ خداوندی جاری ہوتے ہیں۔ اس لئے ٹریفک سگنل کی اطاعت سے اس کی نفس کو بالیدگی ہوگی۔ ہر شہری حکومت کا ٹیکس اس لئے ادا کرتا ہے کہ ٹیکس دینے سے اس کی نفس کو ترقی ملتی ہے اور ٹیکس نہ دینے سے اس کا نفس مضمحل ہوتا ہے۔ اس ریاست میں جرائم کا انسداد خود بخود ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جرائم کے ارتکاب سے اس کا نفس کمزور ہو جاتا ہے۔ اس ریاست میں Sin اور Crime (گناہ اور جرم) ایک ہو جاتے ہیں جو شخص گناہ نہیں کرتا وہ جرم بھی نہیں کرتا۔ آپ اپنے تصور میں غیر اسلامی ریاست کا تصور لائیں کہ ایک شخص روزہ سے ہے سخت گرمی ہے اور وہ شخص تنہا ہے اور اس کے پاس ٹھنڈا پانی موجود ہے، سخت پیاس کے باوجود وہ روزہ نہیں توڑے گا اور ٹھنڈا پانی ہرگز نہیں پیئے گا۔ کیونکہ وہ اسے گناہ سمجھتا ہے۔ لیکن وہ ہی شخص جب باہر جاتا ہے تو وہ ٹریفک سگنل کی پاسداری نہیں کرتا، اور اس کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ سگنل کی خلاف ورزی کرنے سے وہ کوئی گناہ نہیں کر رہا ہے۔ صرف جرم کر رہا ہے اور جرم کی سزا سے وہ اپنے کو محفوظ کر لیتا ہے۔ یہ سیکولر سٹیٹ میں ہوتا ہے اور اس میں کوئی چیز اس کو جرم سے نہیں روک سکتی۔ اسلامی سٹیٹ میں چونکہ ٹریفک سگنل کی خلاف ورزی صرف جرم نہیں ہوگی بلکہ گناہ بھی ہوگا اور اس کا اس کے نفس

پر بُرا اثر پڑے گا اس لئے وہ یہ جرم اور گناہ نہیں کرے گا اور اس طرح نفس انسانی اس نظام کی اساس بن جاتی ہے، اور یہ نہایت مضبوط اساس ہوتی ہے۔

یہ اس لئے بھی اسلامی نظام کی اساس بنتی ہے کہ غیر اسلامی نظام میں قوانینِ خداوندی کی بجائے انسانوں کے وضع کردہ قوانین کی اطاعت کرنی پڑتی ہے اور اس سے قرآن نے منع فرمایا ہے۔ ارشادِ عالی ہے: وَلَا تُطِيعُوٓا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ ﴿١٥١﴾ الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ﴿١٥٢﴾ (26:151-152) ترجمہ: اور بیباک لوگوں کا کہنا نہ مانو، جو ملک میں خرابی کرتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے، شیخ الہند نے مسرف کا ترجمہ بیباک کیا ہے اور دیگر مترجمین نے ''بدنگا'' وغیرہ کیا ہے۔ لیکن یہ غلط ترجمہ ہے۔ قرآن کریم نے خود اس لفظ کی وضاحت کر دی الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ﴿١٥٢﴾ (26:152)، مسرفین وہ ہیں جو ملک میں فساد پھیلاتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔ یہ غیر اسلامی حکومت ہوتی ہے۔ اس میں زندگی بسر کرنے سے منع کیا گیا ہے (6:123) ان کا ٹھکانہ جہنم ہوتا ہے (4:97) اس میں آپ انسانوں کے وضع کردہ قوانین سے بچ نہیں سکے یہ حرام ہے کہ کوئی انسان دوسرے انسان کا محکوم ہو، حکومت صرف اللہ تعالیٰ کو زیب دیتی ہے۔ حکمران ہے ایک وہی باقی بتان آذری۔

(2) نفس انسانی کو نشوونما دینے کا دوسرا ذریعہ اپنا مال دوسروں پر خرچ کرنا ہے الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّىٰ ﴿١٨﴾ (92:18) جو شخص اپنا مال، دوسروں پر خرچ کرتا ہے اس کا نفس ترقی کرتا ہے فرمایا: أَنفِقُوا خَيْرًا لِّأَنفُسِكُمْ ۗ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (64:16) ترجمہ: اور اپنی بھلائی کے لئے خرچ کرتے جاؤ۔ اور جس نے اپنے آپ کو لالچ سے بچا لیا سو وہ ہی لوگ کامیاب ہیں۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہے: وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلِأَنفُسِكُمْ ۚ (2:272) اور جو مال بھی تم خرچ کرتے ہو یہ تمہاری نفسوں کے لئے ہیں۔ جو شخص اپنی ذات میں Believe کرے گا وہ اپنی ذات کی نشوونما کرنے کے لئے دوسروں پر خرچ کرے گا۔ جو شخص اپنی ذات میں ہی Believe نہیں کرتا، نہ اس کی نشوونما میں یقین رکھتا ہے تو وہ دوسروں پر کیوں خرچ کرے گا۔ کیمونزم اسی لئے ناکام ہوا کہ اس میں کوئی Incentive کام کرنے کا نہیں تھا۔ اور نہ ہی اس نظام کی کوئی اساس تھی کہ آدمی کیوں اتنا کام کرے کہ اپنی کمائی دوسروں پر خرچ کرے۔ اپنی نفس کی نشوونما کے لئے دوسروں پر خرچ کرنے کے متعلق قرآن میں لاتعداد آیات ہیں۔ ہم ان پر ہی اکتفاء کرتے ہیں سورۃ البقرہ میں ارشاد ہے: وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ ۖ قُلِ الْعَفْوَ ۗ (2:219) ترجمہ: تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں، کہہ دے جو اپنے خرچ سے بچے۔ قرآنِ کریم میں ضرورت سے زیادہ رکھنے کی اجازت ہی نہیں ہے۔ جب کسی کے پاس دولت ہی نہیں ہوگی تو وہ Money Laundering کیسے کر سکتا ہے اور جب ریاست سب ضروریات پوری کرتی ہے، تو کوئی دولت کس لئے جمع کرے گا۔

جسم انسانی کی پرورش کچھ لینے سے ہوتی ہے۔ ہر شخص روزانہ کھانا کھاتا ہے۔ لیکن نفس انسانی کی پرورش دوسروں کو

دینے سے ہوتی ہے جسم اور نفس دونوں کی پرورش کے طریقے ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ صرف اسلامی نظام ہی بیک وقت دونوں کی پرورش کرسکتا ہے، اس لئے اسلامی نظام قائم کیا جاتا ہے۔

(3) نفس انسانی کو نشوونما دینے کا تیسرا طریقہ صفاتِ خداوندی کو اپنے میں پیدا کرنا ہے، روحِ خداوندی اور انسانی ذات ایک ہی چیز ہے۔ قرآنِ کریم نے جو ''نفخ روح'' کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات کی صلاحیت Potential انسان کو عطا کر دیا ہے۔ اب انسان میں ربوبیت، رحم، کرم، فضل، السلام کی ساری صفات موجود ہیں۔ ہر انسان کا یہ فریضہ ہے کہ وہ ان صفات کو اپنے میں پیدا کرے۔ جس قدر صفاتِ خداوندی کسی میں پیدا ہوں گی۔ اسی قدر اس کو قربِ الٰہی حاصل ہوگا اور انسانی ذات میں استحکام پیدا ہوگا۔ جب حکمتِ الٰہی مقتضی ہوئی کہ اللہ تعالیٰ اپنی صفات کا مظاہرہ کرے تو اس نے اس عالم کو خلق فرمایا (65:12) یعنی زمین و آسمان کی تخلیق، اور ان کا کل نظم و نسق سے مقصود یہ ہے کہ خدا کی قدرت کاملہ اور علم محیط وغیرہ صفات کی معرفت انسانوں کو حاصل ہو۔ تخلیقِ عالم سے یہ غرض بوجہ اتم جب ہی پوری ہوسکتی ہے کہ مخلوقات میں اس کی ہر قسم کی صفات کا اظہار ہو۔ یہ صرف اسلامی مملکت میں ہی ہوسکتا ہے اور اسی لئے اسلامی مملکت کا قیام ضروری ہوتا ہے۔ اس کے بغیر صفات کمالیہ کے اظہار ہونے کی کوئی اور دوسری صورت نہیں ہے۔ اس دنیا کا سارا نظام ایسا ہی رکھا گیا ہے کہ بندوں کو خیر و شر کے اکتساب میں مجبورِ محض نہ بنایا جائے۔ اگر صرف خیر کے اکتساب پر سب کو مجبور کر دیا جاتا تو تخلیق آدم کی حکمت و مصلحت پوری نہ ہوتی اور اللہ تعالیٰ کی بہت سی صفات ایسی رہ جاتیں کہ ان کے ظہور کے لئے کوئی موقع نہ رہتا، مثلاً عفو، غفور، حلیم، منتقم وغیرہ صفات کا ظہور نہ ہوسکتا۔ حالانکہ عالم کو پیدا کرنے کی غرض ہی یہ ہے کہ اس کی تمام صفات کا مظاہرہ ہوجائے۔ کوئی مذہب یا کوئی انسان جو خدا کو فاعل مختار مانتا ہوا نجام کار اس کے علاوہ کوئی دوسری غرض نہیں بتلاسکتا۔ ہم اللہ تعالیٰ کی صفات پر ایمان لاتے ہیں کہ وہ رازق ہے، رب ہے، کریم و رحیم ہے، اس وقت ان صفات پر ہم صرف ایمان لاتے ہیں۔ اسلامی نظام میں ان صفات پر عمل کیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ صفاتِ خداوندی اس بات کی مقتضی ہیں کہ ان پر عمل کیا جائے۔ اسلامی مملکت میں صفاتِ خداوندی جگمگ جگمگ کرتی دکھائی دیتی ہیں کیونکہ ان پر عمل ہو رہا ہوتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ذات حضرت باری تعالیٰ اپنی تمام صفات کے ساتھ جلوہ افروز ہوگئی ہے وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا (39:69) زمین اپنے رب کے نور سے چمک دار بن جاتی ہے۔ اس مملکت میں ہر انسان میں بشری حد کے اندر صفاتِ خداوندی از خود پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں۔ صفاتِ خداوندی کا موضوع بہت دقیق اور بہت دلچسپ ہے۔ اس کی تفصیل علم الکلام کی کتب میں ملتی ہیں۔ علامہ شبلی نے اپنی کتاب ''علم الکلام'' میں اس مضمون کو Touch بھی نہیں کیا۔ البتہ مولانا ادریس کاندھلوی، شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور نے اپنی کتاب علم الکلام میں صفاتِ خداوندی پر کافی صفحات لکھے ہیں، لیکن وہ سب مذہبی نکتہ نگاہ سے تحریر کئے گئے ہیں۔ دینی نکتہ نگاہ سے نہیں لکھے البتہ انگریزی زبان میں اس موضوع پر کچھ

مواد ہے۔ ہمارا ارادہ ہے کہ ہم اس کو اپنی ویب سائٹ پر ڈال دیں گے۔

(4) چوتھا ذریعہ نفس انسانی کے استحکام کا مستقل اقدار پر عمل کرنے کا ہے۔ قرآنِ کریم نے انسانی راہنمائی کے لئے جو اصول عنایت فرمائے ہیں۔ وہ ہی مستقل اقدار میں۔ انسانی ذات کی نشوونما بھی ان اقدار پر عمل کرنے سے ہوتی ہے۔ جس قدر انسانی ذات نشوونما پاتی ہے اسی قدر اس میں صفاتِ خداوندی کا ظہور ہوتا رہتا ہے۔ ان صفاتِ خداوندی پر ہی مبنی اسلامی ریاست کی بنیاد ہوتی ہے۔ جب انسان کا ذاتی مفاد اور مستقل قدر میں Tie آ پڑتی ہے تو اپنے ذاتی مفاد کو چھوڑ کر مستقل قدر پر عمل کرنے سے ذاتِ انسانی کی نشوونما ہوتی ہے۔ ان اقدار کو وضع کرنا۔ عقل انسانی کے بس کی بات نہیں ہے۔ ہر انسان اس موقع پر وحی الٰہی کا محتاج ہوتا ہے۔ مستقل اقدار میں ربوبیت، تکریم انسانیت، وحدتِ انسانیت، تعاون علی البر والتقویٰ کائنات کا بالحق پیدا ہونا، آزادی، عدل وانصاف وغیرہ اہم اور نمایاں درجہ رکھتی ہیں۔ مستقل اقدار کا موضوع سب طویل ہے ہم نے بقدر ضرورت تحریر کر دیا ہے۔

(5) نفسِ انسانی کو نشوونما دینے کا پانچواں طریقہ اقامت دین کی کوشش کرنا ہے جو لوگ اقامت دین کے لئے کوشش کرتے ہیں ان کا وہی مقام ہوتا ہے جو ایک رسول کے ساتھیوں کا ہوتا ہے (9:100) اس آیت کے ذیل میں مولانا محمد شفیع صاحب نے اپنی تفسیر معارف القرآن میں بحث کی ہے کہ تفسیر نمونہ نے معارف القرآن سے بھی زیادہ توجہ اس آیت پر دی ہے۔ اس وقت ساری دنیا میں دین کسی جگہ بھی قائم نہیں ہے ساری دنیا میں صرف تحریکِ طلوعِ اسلام اقامت دین کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان حضرات کا شمار متبعین بالاحسان میں یقیناً ہوتا ہے۔ چونکہ مضمون طویل ہو گیا ہے اس لئے اس شق کے متعلق ہم نے بہت مختصر تحریر کیا ہے۔ لیکن اہمیت کے لحاظ سے یہ شق اوّل نمبر پر آتی ہے۔

عدل قرآنِ کریم کی ایک بنیادی اور اہم ترین مستقل قدر شمار ہوتی ہے جماعت مومنین کا اولین فریضہ یہ ہے کہ وہ عدل قائم کریں۔ اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُ بِالۡعَدۡلِ وَ الۡاِحۡسَانِ (16:90) اللہ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے اس آیت سے یہ بات واضح ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے عدل کرنے کا حکم دیا ہے تو یقیناً وہ قوانین بھی دے گا اور اس کا منشاء یہی ہوگا کہ اس کے قوانین کے مطابق عدل واحسان کیا جائے۔ اس کا یہ منشا ہرگز نہیں ہوسکتا کہ برطانیہ یا بھارت کے قوانین کے مطابق عدل کیا جائے۔ برطانیہ میں ہم جنس پرستی جیسے قوانین موجود ہیں۔ بھارت میں ذات پات اور جاتی سسٹم کی وجہ سے انسان کی تکریم نہیں ہوسکتی۔ مزید یہ کہ آیت میں عدل اور احسان دونوں کا حکم ہے۔ احسان کا تصور قرآن کے علاوہ اور کسی معاشرہ میں ہے ہی نہیں۔ اس آیت کا واضح مفاد ومنشا یہ ہے کہ انسان کے وضع کردہ قوانین کو رد کر دیا جائے اور فرمایا: وَمِمَّنۡ خَلَقۡنَاۤ اُمَّةٌ یَّهۡدُوۡنَ بِالۡحَقِّ وَبِهٖ یَعۡدِلُوۡنَ (7:181)، ترجمہ: اور ان لوگوں میں جن کو ہم نے پیدا کیا ایک جماعت ایسی ہے کہ وہ الحق (وحی الٰہی) کے مطابق فیصلے کرتے ہیں اور اسی کی طرف دعوت دیتی ہے۔

ہر نظام عدل کی بنیاد شہادت پر ہوتی ہے، قرآن کریم نے جو شہادت کا اصول بیان فرمایا ہے۔ انسانیت آج تک اس اصول کو پوری طرح اختیار نہیں کر سکی۔ ارشادِ عالی ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۣ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا (4:135) ترجمہ: اے ایمان والو! مضبوطی کے ساتھ ایمان پر قائم رہو اور خدا لگتی گواہی دو، اگرچہ یہ گواہی خود تمہارے یا تمہارے ماں باپ، یا قرابت داروں کے خلاف ہو، خواہ مال دار ہو یا محتاج کیونکہ خدا تو ان پر زیادہ مہربان ہے۔ تم حق سے کترانے میں خواہشِ نفس کی پیروی نہ کرو اور اگر گھما پھرا کے گواہی دو گے یا انکار کرو گے، تو جو کچھ تم کرتے ہو خدا اس سے خوب واقف ہے۔

ہر مقدمہ میں گواہ کسی نہ کسی پارٹی کا ہوتا ہے یا گواہ مدعی کی طرف سے ہوگا، یا مدعیٰ علیہ کی طرف سے پیش ہوگا جب بھی کوئی گواہ کسی کی طرف سے بھی جائے تو اس کی ہمدردی اور میلان اسی کی طرف ہوگا۔ اس طرح کا رجحان ایک فطری اور قدرتی امر ہے لیکن قرآن اس رجحان کی جڑ اس طرح کاٹ دیتا ہے جبکہ وہ فرماتا ہے کہ تم نہ مدعی کی طرف سے ہو اور نہ مدعیٰ علیہ کی طرف سے ہو۔ تم صرف خدا کی طرف سے پیش ہو رہے ہو اور کسی کی بھی طرفداری نہ کرو، پھر فرمایا خواہ وہ شہادت خود تمہاری ذات کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ خواہ وہ تمہارے ماں باپ کے خلاف ہو اور خواہ امیر و غریب کے خلاف ہو فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۣ (4:135)، اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے وہ خوب جانتا ہے کہ کس کا کیا حق ہے۔

قرآن نے دشمنوں تک سے بھی عدل کرنے کا حکم دیا ہے ایسا حکم صرف قرآن ہی دے سکتا تھا کیونکہ انسان اپنے جذبات سے الگ نہیں ہو سکتا فرمایا: وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ (5:8) اور تمہیں کسی قوم کی عداوت اس جرم میں نہ پھنسا دے کہ ان سے ناانصافی کرو۔ تم ان سے ہر حال میں انصاف کرو کیونکہ یہ تقویٰ کے قریب ہے۔

مسلمانوں کو حکم ہوا کہ اپنے فیصلے صرف خاتم الانبیاء رسول اللہ ﷺ سے کراؤ (4:65) پھر رسول اللہ ﷺ کے فیصلوں کے متعلق فرمایا: ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (4:65)، پھر مومنوں کو اس کے فیصلے کے خلاف دل میں کوئی خلش نہیں رہتی، پھر ان کے فیصلوں کو دل کی آمادگی اور خوشی سے قبول کرتے ہیں۔ لیکن یہ بات اسلامی نظام اور اس کے قوانین میں ہی ہو سکتی ہے۔ اور یہی اسلامی نظام کی بنیاد و اساس ہے۔

ہم نے شروع مضمون میں تحریر کیا تھا کہ عقل انسانی خیر و شر کا مسئلہ آج تک حل نہیں کر سکی اور قرآن کا دعویٰ ہے کہ عقل انسانی یہ مسئلہ حل بھی نہیں کر سکے گی اگر عقل انسانی یہ مسئلہ خود حل کر سکتی، تو پھر وحی الٰہی یا قرآن کے نزول کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ قرآنِ کریم نے اس مسئلہ کو بیشک حل کیا ہے۔ اس نے جو کچھ پیدا کیا ہے وہ طبیعی طور پر اپنی خلقت کے لحاظ سے، خیر ہی

خیر ہے، البتہ ہر چیز کا استعمال اس کو خیر و شر بنا دیتا ہے۔ زہر کے چند قطرے دوا کے اندر نہایت فائدہ مند ہوتے ہیں، لیکن زہر کے سو قطرے ان کی موت کا سبب بن جاتے ہیں، پانی جیسی نعمت خداوندی، جو انسان کو زندگی بخشتی ہے، اسی پانی میں آدمی ڈوب کر فوت ہو جاتا ہے۔ آگ انسان کی زندگی میں موقع بہ موقع کام آتی ہے۔ اسی آگ میں اگر انگلی ڈالے تو جل جاتی ہے تو وہ سخت تکلیف ہو جاتی ہے۔ ہر چیز کو خدا کے قوانین کے مطابق استعمال کرنے سے خیر ہی خیر واقع ہوتا ہے۔ قوانین کی خلاف ورزی کرنے سے، شر کا پہلو پیدا ہوتا ہے۔ نیز اس کا واضح حل یہ ہے کہ کسی چیز کو مستقل اقدار کے مطابق استعمال کرنے سے وہ خیر ہے اسی خیر کو مستقل اقدار کے خلاف استعمال کرنے سے وہ شر ہی شر ہے۔ اللہ تعالیٰ سبحانہٗ خیر کا سرچشمہ و مصدر ہے۔ اس کی پیدا کردہ ہر چیز خیر ہے۔ اس نے صرف خیر پیدا کیا ہے۔ اشیاء کائنات کے غلط استعمال کرنے سے شر پیدا ہوتا ہے جس سے بچنے کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت ہے (113:2) اسی طرح عدالتی نظام کے قوانین ہیں۔ عدالتی نظام کے قوانین اگر مستقل اقدار کے خلاف وضع ہوں گے تو شر ہی شر پیدا ہوگا۔ اگر ان قوانین کو مستقل اقدار کے مطابق تشکیل دیا جائے گا تو معاشرہ میں خیر ہی خیر فروغ پائے گا، اور وہ قوانین عدل و انصاف اور احسان پر قائم ہوں گے۔ عدالت عالیہ و عظمیٰ کا کام یہ ہے کہ وہ موجودہ قوانین کو مستقل اقدار کے مطابق رفتہ رفتہ تبدیل کرتی جائے۔

ہم صرف نمونہ کے طور پر چند اقدار تحریر کرتے ہیں ورنہ قرآن کریم تو ان سے بھرا پڑا ہے۔

(1) جس مملکت کے قوانین مستقل اقدار کے مطابق جاری ہوں گے، اس مملکت کی اطاعت، عبادت خداوندی ہوتی ہے۔ اس مملکت میں پرستش کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس مملکت میں عدالتیں، تھانے، تحصیلیں NGOS سب مساجد اللہ ہوتے ہیں کیونکہ وہاں سے احکاماتِ خداوندی جاری ہوتے ہیں۔

(2) قرآن بدنی سزائیں تجویز کرتا ہے۔ ہمارے جن لیڈروں نے لوٹ مار کی۔ ان کو گیارہ گیارہ سال کی قید درست نہیں کر سکی۔ اگر ان کو بدنی سزا دی جاتی تو وہ لوٹ مار سے اجتناب کرتے۔

(3) اسلامی مملکت میں مستغیث مجرم کے خلاف مدعی نہیں ہوتا وہ حکومت کے خلاف مدعی ہوتا ہے قرآن کے نزدیک وہ خاص فرد مجرم نہیں جس نے ارتکاب جرم کیا۔ مجرم نظام معاشرہ اور خود عدالتیں ہیں۔

(4) قصاص کے معنی صرف جرم کی سزا دینا نہیں ہے۔ اس کے معنی مجرم کا ایسا پیچھا کرنا، کہ اس کو پکڑ لیا جائے۔ اسلامی مملکت میں کوئی مجرم سزا سے نہیں بچ سکتا۔

(5) جرم کی سزا جرم کے مطابق ہونی چاہئے۔ اس سے کم یا زیادہ نہ ہو۔ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ (42:40) کسی جرم کی سزا زیادہ یا کم نہیں ہونی چاہئے۔

ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(قسط نمبر2)

اللہ کا مخلوق کے بطورِ خالقِ کُل مقتدرِ مُطلق کا تصور

اللہ کی ماہیت کے ناقابلِ فہم ہونے کے بارے میں وضاحت:

قرآن کی رو سے خدا کا ذاتی نام اللہ ہے۔ اللہ کیا ہے؟ اس کی ہستی کیسی ہے؟ اس کی ذات کی کنہ وحقیقت کیا ہے، وہ کہاں سے آ گیا یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب عقل انسانی نہیں دے سکتی کہ وہ اِس کے احاطہ سے باہر ہے۔ عقل درحقیقت نام ہے ان مجموعی نتائج کا جو انسان اپنے علم ومشاہدات سے حاصل کرتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ وہ ذرائع جن سے انسان علم حاصل کرتا ہے، محدود ہیں۔ سو جب وہ ذرائع محدود ہیں تو ان ذرائع کا ماحصل بھی محدود ہی ہوگا اور محدود، لامحدود کا ادراک نہیں کرسکتا ہے۔ وہ انسان جو ابھی تک اپنے محدود علم کی بنا پر یہ بھی معلوم نہیں کرسکا کہ وہ خود کیا ہے، تو وہ لامحدود کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ وہ شخص جو مشینری کی حقیقت تک پہنچنے سے عاجز ہے، مشینری بنانے والے کی کنہ وحقیقت کا اندازہ بھی نہیں کرسکتا ہے۔ ہمیں ہر وقت ذہن میں رکھنا ہوگا کہ ذات خداوندی کی ماہیت کا علم، انسان کی سرحد ادراک سے ماوراء ہے۔ جس چیز کو انسان براہ راست نہ سمجھ سکے اس کے متعلق اندازہ لگانے کا دوسرا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اس جیسی کسی دوسری مثیل شے پر غور کرکے اندازہ لگایا جائے۔

قرآن میں ہے کہ: لَیۡسَ کَمِثۡلِہٖ شَیۡءٌ ۚ (42:11) ''اس کی مثل کوئی شے نہیں۔''

محسوسات کا خوگر انسان ہمیشہ یہ چاہتا ہے کہ بسیط سے بسیط حقیقت بھی لباس مجاز میں اس کے سامنے جلوہ بار ہو یا کم از کم اس حقیقت مجردہ کو بیان اس انداز سے کیا جائے کہ وہ اس کے ذہن میں ایک محسوس پیکر کا تصور قائم کرسکے۔ یہی وہ بنیادی غلطی تھی جس کی وجہ سے انسان نے بت پرستی اختیار کی۔ اسلام چونکہ علم وبصیرت کا دین ہے، اس لیے اس نے وہ تمام دروازے بند کردیے جن کے راستے اس قسم کی توہم پرستی ذہن انسانی میں داخل ہوسکتی تھی۔ اس نے ذات باری تعالیٰ کے متعلق کوئی مثال بھی ایسی بیان نہیں کی جس سے ذہن کسی محسوس ومشہود پیکر کی طرف منتقل ہوجائے۔ ذہن انسانی کا تقاضا پورا کرنے کے لیے اسے کسی مجسمہ میں کرنے میں تبدیل کرنے کی بھی قرآن ممانعت کرتا ہے۔

قدیم نظریہ ارتقاء کے مطالعہ میں ہم نے دیکھا کہ لوگ خدا کا متعدد دیوی دیوتاؤں کو خیالی انسانی مجسم ومُثبت ومنفی صِفات کی شکل میں پیش کرتے تھے۔ ہمارے ہاں کے فرقۂ معتزلہ کے نے اللہ الواحد کی صِفات میں مجسم دیوی دیوتاؤں کو ہی

نہیں نکالا، بلکہ اللہ میں انسانوں جیسی صِفات رکھنے کی بھی نفی کر دی۔

معتزلہ کا اللہ کی ماہیت کے بارے میں مؤقف:

اللہ کی ماہیت کے بارے میں امام الحسن نے اپنی کتاب مقالاتِ الاسلامین میں مُعتزلہ کے مؤقف کی وضاحت میں فرمایا کہ:

(1) خدا ایک ہی منفرد ہے۔

(2) وہی الاوّل والآخر ہے۔ مخلوقات سے قبل موجود ہے اور اُس کی ذات کو فنا نہیں۔

(3) وہ عالم وقادر ہے اور ہمیشہ کے لئے زندہ و پائندہ ہے۔

(4) اُس نے جو چاہا پیدا کر دیا۔ اُس نے کوئی چیز مثال دیکھ کر پیدا نہیں کی۔

(5) وہ جسم رکھتا ہے نہ کالبد۔ نہ اس کا جُثہ ہے نہ صورت۔

(6) وہ نہ جوہر ہے نہ عرض۔

(7) نہ اس کا ذائقہ ہے اور وہ خوشبو بھی نہیں رکھتا ہے۔

(8) اسے چھوا بھی نہیں جا سکتا۔

(9) نہ اس میں حرارت ہے نہ رطوبت۔

(10) وہ طول بھی نہیں عرض بھی نہیں اور عمل بھی نہیں

(11) نہ اس میں اجتماع ہے نہ افتراق۔ نہ متحرک ہے نہ ساکن

(12) نہ اس کے الگ اجزاء ہیں اور وہ جوارح واعضاء بھی نہیں رکھتا۔

(13) وہ ذی جہات بھی نہیں نہ اس کا کوئی دایاں ہے نہ بایاں۔ نہ آگا ہے نہ پیچھا۔

(14) وہ اوپر بھی نہیں نیچے بھی نہیں۔

(15) کوئی مکان اس کا احاطہ نہیں کر سکتا اور زمانہ اس پر حاوی نہیں ہو سکتا۔

(16) وہ جدا بھی نہیں اور مِلا ہوا بھی نہیں۔

(17) وہ کسی ایسے وصف سے متصف نہیں کیا جا سکتا جو خلق میں پائے جاتے ہوں اور حادث وفانی ہوں۔

(18) نہ اس کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ متناہی ہے۔

(19) اسے ناپا بھی نہیں جا سکتا۔

(20) وہ مُختلف جہات میں سمایا ہوا نہیں۔

(21) وہ محدود بھی نہیں۔

(22) نہ وہ کسی کا باپ ہے نہ بیٹا۔

(23) تقدیریں اس کا احاطہ نہیں کرسکتیں اور پردے اسے مستور نہیں کرتے

(24) وہ حواس کے ادراک سے بالا ہے۔

(25) اسے لوگوں پر قیاس نہیں کیا جا سکتا اور مخلوقات سے کسی طرح مماثلت نہیں رکھتا اس لئے کہ

(26) نہ اس پر آفات کا نزول ہوسکتا ہے اور نہ مصیبتیں اسے گھیر سکتی ہیں۔

(27) ہر وہ تصور جو وہم میں آسکتا ہے اور ہر وہ بات جو تصور میں آسکتی ہے، اس کی مشابہت سے ماوراء ہے۔

(28) نہ اُسے آنکھ دیکھ سکتی ہے۔ نہ بینائی اُس کا ادراک کرسکتی ہے۔

(29) اذہان اس کا احاطہ نہیں کرسکتے اور سماعت اسے سُن نہیں سکتی۔

(30) وہ الظاہر والباطن ہے۔

(31) اُس مین خون بھی نہیں گوشت بھی نہیں۔

(32) صرف وہی قدیم ہے اور کوئی قدیم نہ ہے۔

(33) صرف وہی معبود ہے اور اُس کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے۔

(34) نہ کوئی اس کے اقتدار میں شریک ہے اور نہ اس کا کوئی وزیر مختار ہے۔

(35) نہ اسے کوئی نفع پہنچ سکتا ہے نہ نقصان

(36) رورولذات سے وہ بیگانہ ہے اور اذیت والم سے نا آشنا ہے

(37) نہ وہ ذی غایت ہے کہ اس کی انتہا ہو

(38) اس کی مرضی وتکوین میں کوئی اس کا معین ومددگار نہیں

(39) نہ اس میں کسی قسم کی کوتاہی یا کمی ہے اور نہ مجبوری اور بے چارگی

(40) نہ اُس کی کوئی بیوی ہے نہ اولاد

معتزلہ نے جہاں انسان سے مشبہ صفات ذکر قرآن میں آیا ہے، اُن کی تاویل اُنہوں نے یہ کی ہے کہ یہ ذاتِ باری تعالیٰ کے اسماء/صِفات ہیں، لہذا اِن کا تعلق انسانی مجسم سے مُطلق نہیں بنتا۔ ذاتِ خداوندی کی ماہیئت کا علم، انسان کی سرحد ادارک سے ماورا ہے۔

قرآن سے بھی اِس کی تصدیق کی گئی ہے کہ ایسی بھی کچھ صفات ذات باری تعالےٰ کی ذات کے ساتھ مختص ہیں اور اِن صِفات میں کوئی بھی اللہ کا اِدراک نہیں کر سکتا۔ قرآن میں ہے کہ

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ (57:3)

وہی اوّل وآخر وظاہر وباطن ہے۔

یہاں چار صِفات کا ذکر ہے۔

(1)الاوّل (2)الآخر (3)الظاہر (4)الباطن

اِن صِفات کے مفہوم کا بیان کیا جاتا ہے کہ:

(1)اللہ تعالیٰ جہت زمان ومکان سے بلند وبالا ہے۔ جب کچھ نہ تھا تو وہ موجود تھا (الاول)۔

(2)جب کچھ نہ ہوگا تو وہ موجود رہے گا (الاخر)

(3-4)ظاہر وباطن ہر جگہ موجود ہے۔

اِن کے علاوہ قرآن نے دو مزید اللہ کی ذات سے مختص صِفات کا ذکر کیا ہے کہ

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَحْيَاكُمْ ۣ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ط (22:66)

''اللہ وہ ہے جس نے تمہیں زندگی عطا فرمائی۔ پھر وہ تمہیں مارے گا۔ اس کے بعد پھر زندہ کرے گا۔''

یہاں درجِ ذیل دو صِفات کا ذکر ہے. جو اللہ ہی کی ذات سے مختص ہے۔

(5)احیاء (زندگی) (6)اماتت (موت)

موت اور حیات بھی اس کے ہاتھ میں ہے، جس میں کوئی شریک نہیں ہوسکتا۔

اِس کی وضاحت میں کہا گیا ہے کہ

وَّلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا (25:3)

موت وحیات اور نشور میں اللہ کے سوا کسی کا اختیار نہیں۔

لہٰذا وہ انسان جو ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں کرسکا کہ وہ خود کیا ہے، وہ کیا معلوم کرسکے گا کہ خدا کیا ہے۔ وہ قوت جو نظم ونسق عالم کو برقرار رکھے ہوئے ہے ماننے والوں کے نزدیک خدا ہے اور نہ ماننے والوں کے نزدیک فطرت ہے۔ نہ ان کا ذہن ذات خداوندی کی ماہیت کا احاطہ کرسکتا ہے نہ یہ فطرت کی حقیقت بتا سکتے ہیں۔ ذہن انسانی محسوسات کی حد تک علت ومعلول کے سلسلہ کو معلوم کرسکتا ہے لیکن علت العلل کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا۔

اللہ کی ذات کا اُس کی صِفات سے اِدراک:

اللہ کا اِدراک جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ عقلِ محض سے نہیں کیا جاتا، جو درحقیقت نام ہے ان مجموعی نتائج کا جو انسان اپنے محدود ذرائع علم ومشاہدات سے حاصل کرتا ہے۔ سو جب وہ ذرائع محدود ہیں تو ان ذرائع کا ماحصل بھی محدود ہی ہوگا۔ اللہ اپنی ذات میں لامحدود ہے اور محدود، لامحدود کا ادراک نہیں کرسکتا۔ وہ انسان جو ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں کرسکا کہ وہ خود کیا ہے، وہ کیا معلوم کرسکے گا کہ خدا کیا ہے۔

فلسفہ میں صِفت سے مراد ہوتی ہے، وہ جو کسی کی اصل ظاہر کرے۔ اِسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ خدا کی ذات کی اصل کا اِدراک بھی اُس کی صِفات سے بھی کیا جاتا ہے۔ صفات خداوندی کے صحیح تصور سے خدائے حقیقی کا صحیح ایمان قلب انسانی میں پیدا ہوتا ہے اوران کے غلط تعین سے انسان باطل پرست ہوجاتا ہے۔قرآن کریم نے صفات خداوندی کو اس شرح وبسط اور صحت وصواب کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ان کی رو سے انسان خدا کے متعلق صحیح تصور قائم کرسکتا ہے۔ مذاہب عالم میں کوئی مذہب ایسا نہیں جو حتم ویقین کے ساتھ کہہ سکے کہ اس کی آسمانی کتاب تحریف والحاق سے پاکیزہ اور ذہن انسانی کی آمیزش سے منزہ ہے۔ حتم ویقین سے ایسا کہنا تو ایک طرف انہیں اس کا اعتراف واقرار ہے کہ ان کے بانی مذہب کی کتاب اپنی اصلی شکل میں ان کے پاس موجود نہیں ہے۔

ہم نے اوپر کانٹ کے حوالہ سے کہا ہے کہ جس قسم کا خدا (یعنی صفات خداوندی) کا تصور ہمارے سامنے ہوگا اسی قسم کی ہماری (انفرادی اوراجتماعی) زندگی ہوگی۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہماری زندگی کا خدا کے تصور کے ساتھ بنیادی تعلق ہے۔ یہ بڑا اہم نکتہ ہے جسے اچھی طرح سے سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔

انسانی زندگی کی ایک سطح وہ ہے جسے حیوانی سطح کہا جاتا ہے۔ یہ زندگی خالص مادی پیکر (آب وگل) کی زندگی ہے جس کا مقصد (دیگر حیوانات کی طرح) تحفظ خویش اور تولید نسل ہے۔ یہ زندگی اس دنیا کی (طبیعی) زندگی ہے اور موت کے ساتھ اس کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ اسے مادی تصور حیات کہتے ہیں۔لیکن قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ انسانی زندگی طبیعی (حیوانی) زندگی سے عبارت نہیں۔ اس کے اندر ایک اور چیز بھی ہے جسے انسانی ذات یا انسانی نفس یا انا یا ایغو کہتے ہیں۔ صِفاتِ خداوندی اور خصوصی طور پر اخلاقی وسماجی جو بہت بڑی اکثریت سے بیان ہوئی ہیں، کا تعلق اِنسانی ذات سے ہے، لہذا وہ وہاں زیرِ مباحث لائی جارہی ہیں۔

ہزاروں چیزیں ایسی ہیں جو ہمارے حواس کی حد کے اندر نہیں آتیں، لیکن غور وفکر کے ذریعے انسان تسلیم کرتا ہے کہ ہاں وہ حقیقت ہے مثلاً جتنی چیزیں بنائی ہوئی ہیں ان کے بارے میں منطقی قوانین کہتے ہیں کہ ان چیزوں کا بنانے والا کوئی ہے۔ آپ کو چیزوں کا کوئی خالق تسلیم کرنا پڑتا ہے، چاہے وہ خالق آپ کے ذہن میں آئے یا نہ آئے۔ فکر کا تقاضا یہ ہے کہ آپ اسے تسلیم کریں۔ اس لئے جو چیزیں انسان کے حواس میں نہیں آسکتیں، قرآن انہیں بھی بغیر فکر اور علم کے ماننے کا تقاضا نہیں کرتا۔ مثلاً غیب کے معاملے میں، خدا کی صفات پر غور وفکر سے تو سارا قرآن بھرا پڑا ہے، لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ قرآن کا آغاز رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کی صِفت کے بیان ہی میں جس آیت سے ہورہا ہے، اُس پر غور وفکر کرنے کے بعد اللہ کی صِفات سے اللہ کی ذات کے تصور کو سمجھنا دشوار نہیں رہتا۔

قرآن میں رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کے الفاظ کے اِظہار سے اللہ کا تصور:

قرآن کی پہلی آیت ہے کہ:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (1:1)

الحمد کے مستحق، صرف اور صرف اللہ کی ربوبیتِ عالمین ہے۔

اِس آیت کے پہلے لفظ الحمد کا مفہوم تعریف کے معانی میں لیا جاتا ہے۔ لفظ تعریف خود عربی زبان کا لفظ ہے، لیکن قرآن کریم میں، خدا کے لیے کہیں بھی تعریف کا لفظ استعمال نہیں ہوا۔ جہاں بھی آیا ہے لفظ حمد ہی آیا ہے۔ لہٰذا اس لفظ کے بنیادی اور حقیقی مفہوم کو سمجھتے ہیں۔ عربوں کے ہاں کسی نہایت حسین، متناسب، نادر شاہکار کو دیکھ اور غور کر کے انسان کے دل میں جو جذباتِ تحسین، وآفریں وستائش کے جو واہ واہ کے بے ساختہ اِلفاظ ازخود منہ سے ادا ہوں تو ایسے ستائش کے جذبات کے والہانہ اظہار کو ''حمد'' کہا جاتا ہے۔ واہ واہ کے والہانہ اظہار کرتے ہوئے ہم درجِ ذیل سے امور کا خیال کر کے متاثر ہو رہے ہوتے ہیں۔

1۔ جس شے کے حسن ورعنائی اور شاہکار کی ستائش یعنی حمد کی جارہی ہے، لازم ہے کہ وہ ایک خارجی حقیقت اور محسوس شے ہو۔ غیر محسوس وغیر مرئی شے کے بارے میں ہمارے دل میں جذباتِ تحسین وستائش پیدا نہیں ہو سکتے۔ مثلاً ہم کسی مصور کی تعریف، اس کی ان تصاویر کے ذریعے ہی کر سکتے ہیں، جو محسوس طور پر ہمارے سامنے آجائیں۔ لہٰذا محض کسی نظریہ یا کسی خیال وتصور کے لئے ''حمد'' کا لفظ نہیں بولا جائے گا۔ نظریہ یا تصور جب محسوس شکل میں سامنے آئے گا اور انسانیت کے لیے مفید نتائج برآمد کرے گا، تو اس وقت اس کی تحسین وستائش کے لیے ''حمد'' کا لفظ بولا جائے گا، اس سے پہلے نہیں۔ خدا کی محسوس کائنات اور اس میں جاری وساری اللہ کی صِفتِ ربوبیت پر قائم قوانین سے ذاتِ خداوندی ہمارے سامنے آجاتی ہے، جس کے مطالعہ ومشاہدے سے تحسین وستائش کے جذبات انسان کے دل میں ابھرتے ہیں۔

2۔ جس بات کی یا کام کی حمد کی جارہی ہو، وہ اختیاری صِفت کے طور پر سرزد ہو۔ بے اختیاری، اضطراری ومیکانکی انداز میں کسی فعل کا سرزد ہو جانا نہ ہی صِفتِ خداوندی میں اور نہ ہی حمد کا سزاوار ہوتا ہے۔ حتّٰی کہ وہ حسن جو کسی میں پیدائشی طور پر موجود ہو یعنی وہ اس کا اپنا اکتسابی نہ ہو، اس کے لیے بھی حمد کے لفظ کی بجائے مدح کا لفظ بولا جاتا ہے۔

3۔ حمد کے لیے ضروری ہے کہ حمد کرنے والے کی یہ آزادانہ دل کی آواز ہو۔ حمد میں جذباتِ تحسین پر مبنی الفاظ بے ساختہ زبان پر آجاتے ہیں۔ اگر جبری طور پر تحسین پر مبنی الفاظ کہلوائے جائیں، تو یہ نہ ہی صِفت میں شمار ہوگی اور نہ ہی حمد میں، بلکہ مدح ہوگی۔ حمد میں تصنع اور بناوٹ سے نہیں، بلکہ دل سے بے ساختہ تحسین وآفرین پر مبنی الفاظ زبان سے ادا ہوتے ہیں۔

4۔ جس شاہکار کی حمد کی جارہی ہے، اس کی نفع بخشیاں، کشش انگیزیاں، رعنائیاں اور حسن وتناسب کمال درجہ تک پہنچ چکا ہو۔ مستحق حمد وہی شے ہوگی جو نوعِ انسانی کے لیے نفع بخشی میں کسی قسم کی کمی کا موجب نہ ہو۔

5۔ جس صِفت کی حمد کی جارہی ہے، اس کا ٹھیک ٹھیک علم ہونا بھی ضروری ہے۔ محض گمان کی بنا پر حمد نہیں کی جاسکتی۔ مبہم تصورات، دھندلے نقوش، شکوک اور تذبذب پیدا کرنے والے جذبات وخیالات اور معتقدات کبھی ''حمد'' کا جذبہ پیدا نہیں

کر سکتے۔ فروعی تخیل، تو اہم پرستی اور اندھی عقیدت سے بھی حمد نہیں ابھرتی۔ حمد کے ابھرنے کا سرچشمہ وہ یقینِ محکم ہوتا ہے، جو علٰی وجہ البصیرت حاصل ہو۔

اِن میں ایک کی بھی کمی ہو، تو وہ حمد نہیں بلکہ مدح کہلاتی ہے۔

اِس آیت میں بیان ہوئے دوسرے لفظ اللہ کا مفہوم ہم ابھی بیان کر چکے ہیں۔ خدا کی ذات کے متعلق جب بات کی جائے گی، تو اس کی صفات کے حوالے سے کی جائے گی، کیونکہ قرآن نے کہا ہے

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۫ (6:104)

''انسان اس کا (صِفات کے علاوہ) ادراک ہی نہیں کر سکتا''۔

اِس آیت میں تیسرے لفظ رب کے بنیادی معنی نشوونما دینا یعنی کسی چیز کو نئی نئی تبدیلیوں سے اس طرح گزارنا کہ وہ بتدریج نشوونما پاتی ہوئی، اپنے اُس نقطۂ تکمیل تک پہنچ جائے، جو اس کے لیے خدا نے متعین کیا ہوا ہے۔ کسی شے کا نقطۂ آغاز سے نشوونما دیتے ہوئے پایہ تکمیل تک پہنچانے کا طریق، جس میں اصلاح کرنے والا، آگے بڑھانے والا، اور اس انداز سے آگے بڑھانے والا کہ کہ جو کچھ اس نے بننا ہے، وہ کچھ بطریق احسن بن جائے شامل ہوتا ہے۔

چوتھا لفظ عالمین، عالم کی جمع ہے۔ لہٰذا اس کے معنی ہوئے کائناتیں۔ ایک تو کائنات وہ ہے، جسے ہم جانتے ہیں، دوسری کائناتیں وہ ہیں جن سے ہم ابھی واقف نہیں ہوئے ہیں۔ معنی علامت کے اعتبار سے یہ محسوس کائنات مقصود بالذّت نہیں ہے۔ صرف علامت ہے، اس بات کی کہ کوئی اس کا خالق ہے۔ لہٰذا، محسوس کائنات، غیر محسوس خالق (خدا) کو پہچاننے کی فقط علامت یا ذریعہ کہلائے گی۔ اِن معانی کے اعتبار سے رب العالمین کے معنی ہوں گے ''تمام نوع انسانی کی نشوونما کا ذمہ دار''۔ ہم اس کے لیے عام طور پر عالمگیر ربوبیت کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ خدا کے عالمگیر انسانیت کی ربوبیت سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کا خدا، کسی خاص قبیلہ، نسل، قوم یا کسی خاص مذہب کا رب نہیں ہے۔ وہ تو عالمگیر انسانیت کا رب ہے۔ اسی سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ قرآنی خدا پر ایمان رکھنے والی جماعت جب نظام متشکل کرے گی، تو وہ نوع انسانی کو سامان نشوونما بہم پہنچانے کی ذمہ داری اپنے سر لے گی۔

اِس آیت کے الگ الگ مفہوم جاننے کے بعد اب ہم پوری آیت کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (1:1)

جب اِنسان اِس کارگہ کائنات کے نظم و نسق پر غور کرتا ہے، تو اُس کے سامنے یہ حقیقت بے نقاب ہو کر آ جاتی ہے کہ اِس میں ہر شے کو سامانِ نشوؤ نماء کس طرح بلا مزد و معاوضہ ملتا چلا جاتا ہے، جس سے وہ اپنے نقطہ آغاز سے بتدریج مقامِ تکمیل تک پہنچ جاتی ہے۔ اِس حیرت انگیز نظامِ ربوبیت کو دیکھ کر، ہر صاحبِ بصیرت کی زبان پر بے اختیار کلماتِ تحسین و آفرین آ جاتے ہیں۔

اب ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اللہ کی صِفتِ ربوبیت اللہ کی ذات کو نہایت ہی صاف وشفاف انداز میں ہمارے سامنے لا رہی ہیں۔ ایسی صِفات سے قرآن بھرا پڑا ہے، لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اِس پر غور کرنے کے بعد کسی دوسری صِفت کے بیان کر کے وضاحت کرنے کی ضرورت نہیں رہتی، کہ جس سے اللہ کی صِفات کا کائنات میں نظم ونسق دیکھ کر اللہ کی ذات کا محسوس تصور سامنے آنے میں زیادہ آسانی رہے۔ ہماری اِس پوری تصنیف میں اللہ کی ذات کی صِفات کا بیان آپ کو ہر جگہ طویل مباحث لئے ہوئے ملے گا۔ لیکن ہر جگہ اللہ کے تصور کو محسوس کرنے کے لئے غور فِکر کرنے کی بنیادی شرط رکھی گئی ہے، جس کی پابندی کئے بغیر ایسا ممکن نہیں ہے۔ اِس کی وضاحت کی جارہی ہے۔

ابھی تک ہم یہ معلوم کر چکے ہیں کہ خدا کی ذات کی تلاش اور اُس کی حمد محسوس مظاہر فطرت پر غور وتدبر کی رو سے ہی ممکن ہے، لہٰذا مومنین کا بنیادی فریضہ ہوگا کہ وہ کہ وہ اللہ کی ذاتُ الحق کو اُس کے سرسید احمد خاں کے الفاظ میں ورکس آف گاڈ نیچر یعنی کائنات پر غور وفکر سے سمجھنے کی کوشش کریں۔ کائنات کے مختلف گوشوں میں تحقیقات کریں اور ان کے محسوس نتائج کی نفع بخشیوں کو نوع انسانی کے لیے عام کر کے حمدِ خداوندی کا عملی ثبوت دیں۔ اِنہی اربابِ فکر ونظر کی تعریف میں قرآن کہتا ہے کہ ''

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ (3:190-191)

یہ حقیقت ہے کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کی تخلیق اور رات اور دن کی گردش میں صاحبان عقل وبصیرت کے لیے حقیقت تک پہنچنے کی بڑی نشانیاں ہیں یعنی یہ وہ لوگ ہیں جو اٹھتے، بیٹھتے، لیٹتے، ہر آن قوانین خداوندی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں، تخلیق ارض وسماء پر غور وفکر کرتے ہیں اور بے اختیار پکار اٹھتے ہیں کہ ''اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے اس سلسلہء کائنات کو نہ تو بے مقصد پیدا ہے اور نہ ہی تخریبی مقاصد کے لیے۔

ہمارے ہاں تو علماء کا تصور ہی کچھ اور ہے، لیکن قرآن نے اربابِ فکر ونظر کو علما کہا ہے۔ یہ کائنات کے نظم ونسق کے انتظام کرنے والی ملائکہ کی قوتوں پر غور وفکر سے اُن کی تسخیر سے نوعِ انسانی کے لئے آسانیاں لانے کا موجب بنتے ہیں۔

ملائکہ کا اللہ کے تدبیرِ امور سرانجام دینے کی قوت کا تصور:

ملائکہ کے بارے میں بعض کے خیال میں اس کا مادہ ''ا۔ل۔ک'' ہے، اور بعض دوسروں کے خیال میں اس کا مادہ ''م۔ل۔ک'' ہے۔ مادہ ''ا۔ل۔ک'' الک کی رو سے معانی پیغام رسانی کے ہیں۔ پیغام رسانی، کے ضِمن میں قرآن میں ہے کہ

اَللّٰهُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ؕ (22:75)

اللہ نے ملائکہ میں سے بعض کو پیام رسانی کے لیے منتخب کرلیا، اسی طرح بعض انسانوں کو بھی۔

ملائکہ میں جبرآئیل کا نام قرآن میں دیا گیا ہے جس کا فریضہ نبی کو کلام الٰہی الوحی کے پہنچانے کا لگایا گیا تھا۔

محمد اکرم راٹھور صاحب کی وفات پر تعزیت نامے

محترم راٹھور صاحب کی گراں بہا خدمات خدائے ذوالجلال کا پیغام انسانیت تک پہنچانے میں صرف ہوئیں۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انکی ذات کی ارتقائی منازل کو درجہ بدرجہ بلند سے بلند کرے۔ اٰمین۔ محترم خورشید انور صاحب کو قائم مقام چیئرمین ادارہ طلوعِ اسلام کا منصب سنبھالنے پر دلی مبارکباد اور ہزاروں نیک تمنائیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو ہمت عطا کرے کہ وہ خدا کے اس پیغام (قرآن) کو دوسروں تک پہنچانے میں اپنی انتہائی کوششوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اور اپنے رفقاء کے تعاون سے اس فریضے کو سرانجام دیں۔ اگر ممکن ہو اور حالات اجازت دیں تو جنرل کونسل کا اجلاس بلایا جائے تاکہ نئے ایجنڈا پر کام شروع کیا جا سکے۔ ہمارا تعاون اور تجاویز آپ کے ساتھ رہیں گی۔

(خیر اندیش، ڈاکٹر حامد میاں)

محترم اکرم راٹھور مرحوم کی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ محترم خورشید انور صاحب کو بطور قائم مقام چیئرمین ادارہ طلوعِ اسلام ذمہ داریاں سنبھالنے پر مبارک باد پیش ہے۔ اُمید ہے وہ ان ذمہ داریوں کو احسن طریقے سے سرانجام دیں گے۔

(آصف جلیل، کراچی)

Akram Rathore Sahib marrhoom's services for dissemination of the message of the Qur'an are truly commendable May Allah bless his soul. Aameen.

Now that Khursheed Anwar Sahib has been entrusted with the responsibility of Chairmanship of the Idaara, our best wishes are with him. May Allah enable him to take the work of the Idaara to even higher levels.

(Prof. Dr. Saliha Nagmi)

کس کی بنی ہے عالمِ ناپائدار میں۔ آپ کی وفات کی خبر سن کر نہایت صدمہ اور قلق ہوا۔ آپ ایک مخلص، ملنسار، ہنس مکھ اور بڑھاپے میں بھی محنتی انسان تھے۔ متحدہ پاکستان کے وقت مشرقی پاکستان میں تاج کمپنی کے ساتھ وابستہ تھے اور وہاں بھی

بزم طلوع اسلام قائم کر لی تھی۔ فکر قرآنی سے وابستہ ہر فرد سے ذاتی رابطہ قائم رکھتے۔ اچھے لحن کے مالک تھے۔ طلوع اسلام کے کنونشنز میں کلام اقبال سناتے۔ قرآن مجید سے بے پناہ عشق و محبت اور عقیدت رکھتے تھے۔ عمر بھر قرآنی فکر کی ترویج و اشاعت کے لئے متحرک رہے۔ آپ کی موت سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ مشکل سے پر ہوگا۔ دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور اعلیٰ درجات عطا فرمائے۔ فکر قرآنی کی اشاعت کے لئے ان کی کاوشوں کو شرف قبولیت بخشے۔ اللہ تعالیٰ ان کے چاہنے والوں اور پسماندگان کو صبر جمیل دے۔ امین۔

(ملک محمد صفدر فیضی ایڈووکیٹ، ملتان)

محمد اکرم راٹھور صاحب جس ادارہ کے چیئرمین تھے وہ ادارہ قرآنی تعلیمات کے ساتھ ساتھ تحریک پاکستان سے بھی ہم آہنگ تھا پاکستان کا 27 رمضان المبارک کو معرض وجود میں آنا اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت تھی اور اب اکرم صاحب کا آزادی یعنی اگست کے مہینے میں وفات پا جانا اس بات کی علامت ہے آپ بھی قائدِ اعظمؒ کے سپاہیوں میں شامل ہو گئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کے درجات بھی بلند ہو چکے ہوں گے۔ آمین

قرآنی تعلیمات سے محروم معاشرے میں اپنی ساری زندگی احکام و اصول اور اقدار خداوندی کو عام کرنے کی جدوجہد میں گزارنا یہ نظریاتی جہاد کہلاتا ہے اور اس میں اپنی جان تک دے دینا شہادت کہلاتا ہے ایسا ہی اکرم راٹھور صاحب نے کیا اور شہادت کا رتبہ پا گئے۔

(محمد ارشد، بزم لاہور)

ادارہ طلوعِ اسلام میں مرحوم و مغفور محترم محمد اکرم راٹھور صاحب کی شخصیت ایک گھنے سایہ دار درخت کی مانند تھی جن کے ٹھنڈے سایہ کے ساتھ بھرپور پھلوں کی وجہ سے شاخیں جھکی ہوئی تھیں اور ہم بزم لاہور والوں کے لئے وہ ایک کمپیوٹرائزڈ انسائیکلوپیڈیا کی طرح تھے۔ ہمیں کوئی بھی استفسار کرنا ہوتا وہ فوراً دروس القرآن کی متعلقہ جلد الماری سے نکلواتے صفحہ نکال کر پڑھنے کو کہتے اور مسئلہ حل ہو جاتا۔ ان کا یوں ہم سے جدا ہونا جہاں ہم سب کے لئے ایک خلاء پیدا کر گیا وہیں۔۔۔ ایک گھنا درخت جب ختم ہوتا ہے تو سب سے زیادہ نقصان ان پرندوں کا ہوتا ہے جن کے گھونسلے اُس درخت میں ہوتے ہیں اور طلوع اسلام کے اس درخت میں جن پرندوں کے گھونسلے ہیں وہ ہمارے مینیجر محمد سلیم اختر صاحب، آئی ٹی کے حفیظ الرحمٰن صاحب اور آفس اسسٹنٹس ظفر اور عبدالواحد صاحب ہیں جن کی جاب کے تسلسل کی ذمہ داری کو ہم سب کو ملکر تحفظ دینا ہے۔ میں محترم جناب خورشید انور صاحب کو چیئرمین کی ذمہ داریاں سنبھالنے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے فرائض کی انجام دہی میں ان کی مدد فرمائیں اور طلوع اسلام کے ان ملازمین کے لئے اندرون ملک اور بیرون ملک طلوع اسلام کی بزموں کو بھی اس سلسلے میں اعتماد میں لیں اللہ تعالیٰ جناب خورشید انور صاحب کو اس میں بھی سرخرو فرمائیں آمین۔

(محمد عمر، لاہور)

''قرارداد تعزیت''

اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے!

25 اگست 2020ء کی علی الصبح فون کی گھنٹی بجی محترم محمد ارشد صاحب نے افسوس ناک خبر سنائی۔

ناوک نے تیرے تیر وہ مارا کہ ہائے ہائے!

چیئرمین ادارہ طلوع اسلام محمد اکرم راٹھور صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے ان کی وفات کی خبر سن کر دل، دماغ، اعصاب سکتے میں آ گئے دل نہیں مان رہا تھا۔

کتنی مشکل زندگی ہے کس قدر آساں ہے موت
گلشن ہستی میں مانندِ نسیم ارزاں ہے موت

موت کی یہ ارزانی ہم سے اُن کو دور تو لے گئی لیکن اس کے بے رحم ہاتھ ان کی خوشگوار اور روشن زندگی کے نقش ہم سفروں کے دلوں سے محو نہیں کر سکے گی۔ زندگی ماہ و سال سے عبارت نہیں یہ پیمانہ کم مائیگی اور دُوں ہمتی کا معیار ہے مگر

جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں
اِدھر نکلے اُدھر ڈوبے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

زندگی زندہ کارناموں، جہد مسلسل اور اعمال صالح سے برومند ہے تو مرحوم کس طرح موت کا شکار ہو سکتے ہیں؟ وہ تو گرم دم گفتگو اور گرم دم جستجو بھی تھے۔ ان تھک محنتی اور فکر قرآنی کے جذبہ سے سرشار، پرویز صاحب کے دیرینہ ساتھی تھے۔

مرحوم تحریک طلوع اسلام کی سالانہ کنونشنوں، سب کنونشنوں، سیمیناروں اور قومی تہواروں میں آنے والے مہمانوں سے اس طرح ملتے کہ مہمان سفر کی تھکن ہی بھول جاتے۔

وہ اپنے پسماندگان کو سوگوار چھوڑ گئے۔ اللہ تعالیٰ پسماندگان کو ہمت اور توفیق دے وہ اس صدمہ کو برداشت کر سکیں اور مرحوم کی امنگوں اور آرزوؤں کی تکمیل کر سکیں۔

سوگواران و نیازمندان
نمائندہ و جملہ اراکین بزم طلوع اسلام پنج کسی

محمد اکرم راٹھور صاحب انتقال فرما گئے۔ اراکینِ بزم طلوعِ اسلام چنیوٹ نے یہ خبر انتہائی دکھ کے ساتھ پڑھی۔ مرحوم کی فکرِ قرآنی سے وابستگی اور ادارہ کے لئے خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی دُعا ہے اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند فرمائے۔ اراکین بزم طلوعِ اسلام چینوٹ مرحوم کے پسماندگان اور لواحقین کے غم میں شریک ہیں۔

(نمائندہ دلمیر خان و اراکینِ بزم چنیوٹ)

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

چیئرمین ادارہ طلوع اسلام جناب محمد اکرم راٹھور ہم سے جدا ہو گئے۔ مرحوم ہم سب میں کسی کے لئے بھی اجنبی نہیں تھے۔ جتنا میں ان کو جانتا تھا میں انتہائی وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ سب اس سے کہیں زیادہ ان کو جانتے تھے۔ مرحوم جتنے خوش آواز اور خوش لباس تھے اس سے کہیں زیادہ خوش اخلاق اور خوش مزاج تھے۔ محترم باباجی کی محفل کا اثر اور قرآن کی تعلیم ان کے کردار میں جھلک رہے تھے۔ اور قرآنی تعلیم کا ہی اثر تھا کہ جوں جوں، ان کی ذمہ داریاں بڑھتی گئیں اتنی ہی کردار میں عجز و انکساری میں اضافہ دیکھنے میں آیا جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے۔ کَشَجَرَۃٍ طَیِّبَۃٍ اَصْلُھَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُھَا فِی السَّمَآءِ ﴿۲۴﴾ (14:24) یعنی اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک پاکیزہ درخت جس کی جڑ زمین میں مضبوط اور جس کی شاخیں آسمان میں ہیں۔ بقول شاعر ؎

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی سکھائے کس نے اسماعیل کو آداب فرزندی

لیکن ہم قرآن کے طالب علم ہیں اور ہمارا ایمان یہ ہے کہ کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَۃُ الْمَوْتِ (29:57)۔ اور کائنات کی عظیم ترین ہستی کے متعلق بھی قرآن کا ارشاد ہے کہ: وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِہِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاْئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓی اَعْقَابِکُمْ ؕ وَمَنْ یَّنْقَلِبْ عَلٰی عَقِبَیْہِ فَلَنْ یَّضُرَّ اللّٰہَ شَیْئًا ؕ وَسَیَجْزِی اللّٰہُ الشّٰکِرِیْنَ ﴿۱۴۴﴾ (3:144) مفہوم: موت اور مقابلہ کا ذکر آ گیا تو اس ضمن ایک اور اہم اصول کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے۔ وہ یہ کہ تم اپنی زندگی اور قوت کا راز اپنے نظام کے استحکام میں سمجھو۔ اسے شخصیتوں کے ساتھ وابستہ مت کرو۔ چھوٹی چھوٹی شخصیتیں تو ایک طرف، اس باب میں تو محمد ﷺ جیسی بلند ترین شخصیت کا بھی یہ عالم ہے کہ وہ صرف خدا کا پیغام پہنچانے والا ہے۔ اس سے پہلے اسی طرح بہت سے پیغام پہنچانے والے آئے اور اپنا فریضہ ادا کر کے چلے گئے۔ لہٰذا اگر یہ پیغام رساں (محمد ﷺ) کل کو وفات پا جائے یا شہید کر دیا جائے تو کیا تم سمجھو گے کہ اس کی وفات سے یہ سارا نظام ختم ہو گیا؟ اور اس کے بعد تم اپنی قدیم روش کی طرف پلٹ جاؤ گے؟ یاد رکھو جو ایسا کرے گا وہ خدا کا کچھ نہیں بگاڑے گا خود اپنا ہی نقصان کرے گا۔ لیکن جو ایمان کی روش پر قائم رہے گا اور اس نظام کی قدر شناسی کرے گا تو اسے اس کی کوششوں کا پورا پورا صلہ ملے گا۔

چنانچہ قرآنی تعلیم کی روشنی میں گذری ہوئی ہستیوں کو بھولے بغیر ہم نے اپنا سفر جاری رکھنا ہے۔ اب ہم نے سر جوڑ کر بیٹھنا ہے اور اس بات پر سوچنا ہے کہ اس ناقابل تلافی نقصان کا ازالہ کیسے کرنا ہے اور اس خلاء کو کیسے پُر کرنا ہے جس کا پر کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ لیکن کیا کریں کہ اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔

خورشید انور
قائم مقام چیئرمین ادارہِ طلوعِ اسلام

یہ چمن سے کون چلا گیا

جب محترم جناب محمد اکرم راٹھور صاحب کی رحلت کا سنا تو یادوں کا ایک سیلاب اُمڈ آیا اور یادوں کو سمیٹتے ہوئے مجھے وہ دن یاد ہیں، جب جنوری 1974ء میں بزم کراچی کے دفتر دارالقائد ناظم آباد کراچی میں ایک جوان رعنا سے ملاقات ہوئی جو چار سو ذمہ داریاں نبھانے میں محترم محمد اسلام نمائندہ بزم کے اشارۂ ابرو کا منتظر رہتا اور پھر قافلۂ بزم، لاہور کنونشن کی تیاری میں مصروف تھا۔ اُنہوں نے انتہائی جانفشانی سے انتظام وانصرام کئے اور احباب کی ہر طرح کی دلجوئی کا خیال رکھا اور۔ یہ سفر یادگار بنا دیا۔

یوں تین سال تک ان سے رابطہ رہا اور اُنہوں نے بزم کے ہر ایک رکن کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ پھر جب وہ لاہور میں مکین ہوئے تو یہاں بھی جس جگہ موقع پایا اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ خاص کر بطورِ نمائندہ وچیئرمین ادارہ سے وابستگی کا جنون آخر دم تک نبھایا۔

جو بھی ان سے مل لیتا ان کا گرویدہ ہو جاتا اور ان پر علامہ اقبالؒ کا یہ مصرعہ صادق آتا تھا:

نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو

ان کی موجودگی ادارہ میں ایک پیر مغاں جیسی تھی۔ اور دل لبھانے والا انداز ناقابلِ فراموش ہے۔ 22 اگست 2020ء ہفتہ کی شام کو میں نے فون پر مرزا ظہور الحق صاحب کی رحلت کا وٹس ایپ کرنے کی اطلاع کی تو اُنہوں نے فرمایا کہ یہ رسالہ بائنڈنگ میں ہے۔ بہرحال کوشش ہوگی کہ شائع ہو جائے۔ ان کی گفتگو میں وہی طنطنہ اور ولولہ تھا اور کسی قسم کی بیماری یا پریشانی کا اظہار نہ ہوتا تھا، یوں اُنہوں نے ادارہ سے جنون اپنی آخری سانس تک نبھایا اور یوں اُن کے سفرِ آخرت کا پیغام مجھے 25 اگست جب سوا 9 بجے ملا تو ایک بے بسی کا احساس ہوا اور ایک پرخلوص ساتھ سے جدائی نے بڑا دلگیر کیا۔

دعا ہے کہ خدا اُنہیں بلند درجات پر فائز کرے اور اپنے دیرینہ ساتھیوں سے سامنا ہو تو وہ شاد ہوں۔

اراکینِ بزم راولپنڈی ان کے اہلِ خانہ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔

ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام، راولپنڈی

امجد محمود، راولپنڈی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دُرِ کمیاب

دُنیا میں مختلف قسم کے لوگ ہوتے ہیں کچھ ایسے کہ اُن پر نظر پڑے تو ان کے قریب ہونے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن اگر کبھی اُن سے کوئی معاملہ آن پڑے تو یوں کہئے کہ وہ تجربہ کوئی اچھا ثابت نہیں ہوتا کیونکہ اُن کا باطن اُن کے ظاہر سے بڑا مختلف نظر آتا ہے۔ دوسری قسم کے لوگ وہ ہوتے ہیں جن کو ظاہری طور پر تو دیکھنا گوارا نہیں ہوتا۔ لیکن وہ اپنے اندر سے بڑے خوبصورت اور دل نشیں ہوتے ہیں یعنی ان کے ظاہر کو دیکھ کر انسان چاہتا ہے کہ ان سے دُور رہا جائے لیکن جب کبھی گردش لیل ونہار میں چلتے پھرتے کسی حوالے سے ان کا اندرونی انسان نظر آجائے تو ان کے اندرونی پن کو دیکھ اور محسوس کر کے بندہ عش عش کر اُٹھتا ہے کہ یہ اس قدر رل دار اور حسین ودلکش بھی ہو سکتے ہیں۔ ظاہر بُرا اور باطن اچھا یہ دوسری قسم کے انسان ہیں۔

اب ایک تیسری قسم بھی ہوتی ہے جو اپنی شخصیت کے ان ہر دو حوالوں سے یعنی اپنے ظاہر اور باطن میں مکمل طور پر ہم آہنگ ہوتی ہے کہ جیسے یہ نظر آتے ہیں اپنے اندر سے بھی یہ ویسے ہی ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ہر قسم کی بناوٹ سے پاک اور ہر طرح کے کھوٹ سے کوسوں دُور ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کو جب کوئی دیکھتا ہے تو دُور سے ہی کہہ اُٹھتا ہے کہ یہ قابلِ بھروسہ انسان ہیں ان پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ ایسے لوگوں کا باطن اُن کے چہروں کے تاثرات اور رنگوں سے چھلک رہا ہوتا ہے۔ اُن کی حرکات وسکنات اور چال ڈھال سے سنجیدگی اور وقار ٹپک رہا ہوتا ہے۔ اُن کی سادگی اور اُن کے کردار کی پاکیزگی وخوبصورتی اُن کی راہوں کو ہر طرح کی تاریکیوں سے محفوظ رکھتے ہوئے پُرنُور بنائے چلی جاتی ہے۔ یہ بہت بڑا انعامِ خداوندی ہے جو اگر کسی کو نصیب ہو جائے۔

میں نے اُوپر جو دوسری قسم کے لوگوں کا ذکر کیا ہے وہ بے شک اپنے باطن میں بہت اچھے، خوبصورت اور دلکش ہوتے ہیں لیکن اپنے ظاہر کے نقص کی وجہ سے لوگوں میں بہت کم ہر دل عزیز، مقبول اور پسندیدہ قرار پاتے ہیں۔ اُن کی شخصیت کی وہ جو ظاہری کمی اور تیرگی ہوتی ہے وہ دوسروں کو ہمیشہ شک وشبہ میں اور عجب سے ابہام میں مبتلا رکھتی ہے لوگ اُن کے قریب جانے میں بڑی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ٹھیک ہی کہا ہے علامہ پرویزؒ (باباجی محترم) نے کہ گومگو کی حالت اور کیفیت بڑی ہی گمراہ کُن ہوتی ہے۔ یہ انسان کو کبھی کسی ایک رُخ اور سمت میں نہیں ہو جانے دیتی بلکہ سدا پریشان حال رکھتی ہے۔

وقت کی رائگانی ہوتی رہتی ہے اور فیصلہ نہیں ہو پاتا۔ فیصلہ تب ہوتا ہے جب راستہ واضح، صاف وشفاف اور بانشاں ہو۔ اگر انسانی شخصیت اور کردار کو نمایاں کرنے والے نشاں اور علامات واضح، دوٹوک اور شفافیت پر مبنی نہ ہوں تو فیصلہ خاصہ مشکل ہوتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ صورتِ حالات اگر ایسی ہے تو یہ سودا انسان کے لئے بڑا نقصان رساں ہے۔

میں جس شخصیت کی تعظیم میں یہ مضمون لکھ رہا ہوں۔ اُن کا شمار تیسری قسم کی شخصیات کے زمرہ میں ہوتا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا شدہ بڑے خاص تحفے ہوتے ہیں اور اپنے کردار وشخصیت کے ظاہر و باطن کی یک رنگی اور ہم آہنگی کی بنا پر ربِ کریم کی نعمتوں کے حقیقی وارث۔

یہ شخصیت جو قرآنِ کریم اور مفسرِ قرآن کریم (باباجیؒ) کے قریبی رفیقان کے زمرے میں شامل ہیں۔ گذشتہ دنوں مورخہ 16 اگست 2020ء کو تقریباً پچانوے برس کی عمر میں ہم سے جُدا ہو گئے، خداوند کریم ان کی مغفرت فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ لواحقین کو صبرِ جمیل عطا کرے (آمین ثم آمین)

انتہائی سادہ اور پُرخلوص انسان، انسانوں سے محبت کرنے والے، خوددار، متوسط الحال زندگی میں بڑے مطمئن اور پُرسکون، پیدل چلنے کے شوقین، رہن سہن میں کوئی بناوٹ اور دکھاوا نہیں، وسائل بڑے محدود لیکن دل لامحدود۔

1956ء سے تحریکِ طلوعِ اسلام سے منسلک، ہر وقت تحریک کے کاموں میں مصروف۔ جس کام کو اپنے ذمہ لیا وہ دِن ہو یا رات اُسے پایۂ تکمیل تک پہنچا کر دم لیا، ریلوے میں ملازم تھے اور اس ملازمت کے ساتھ کوئی دوسرا کام نہیں کیا تاکہ وقت تحریک کے لئے استعمال کیا جائے۔ سائیکل یا کوئی اور سواری میسر نہیں، پرچے کی تقسیم اور ترسیل کے لئے پیدل دوڑ دھوپ انتہا درجے کے تیز اور پھرتیلے، سکاؤٹ بھی رہے۔ تاریخ پیدائش 18 اپریل 1925ء۔ آس پاس سے ہر طرح کی مخالفت کے علی الرغم اپنی تحریک اور قرآنی فکر کے پھیلاؤ کے لئے سرتوڑ کوششوں میں ہمہ وقت مصروف رہے۔

شروع شروع میں جب باباجیؒ راولپنڈی تشریف لائے تو پنڈی بزم کی طرف سے باباجیؒ کے لئے ''وزیر مہمان داری'' کی خدمات کے لئے یہی حضرت مقرر تھے۔ وضو کے لئے صبح سویرے اُٹھ کر پانی گرم کرنا، وضو کروانا وغیرہ وغیرہ باباجیؒ کے ساتھ مزاحیہ گفتگو اور میٹھی میٹھی باتوں کا تبادلۂ خیالات الغرض تحریکِ طلوعِ اسلام پنڈی کے روحِ رواں اور شہر کے ماتھے کا جھومر، راقم کا موصوف سے کوئی سن 1980ء کا تعلق ہے۔ انتہائی نفیس انسان تھے۔ ان موصوف کا نامِ گرامی محترم ومکرم جناب مرزا ظہور الحق ہے۔ ان کا گزر جانا ہمارا بہت بڑا نقصان ہے، لیکن ہم نے کسی بھی طرح کے نقصان کو کسی بھی حوالے سے اپنے اعصاب پر سوار کر کے بے عمل نہیں ہو جانا بلکہ انہی جیسا انسان بن کر عمل کے میدان میں اور آگے بڑھنا ہے اور تحریک کے کاموں میں اور زیادہ شدت سے مصروف ہو جانا ہے۔ اللہ ہمارا حامی وناصر ہو۔ میں نے مضمون کا عنوان ''درِ کمیاب'' رکھا۔ واقعی ان جیسے انسان دُرِ کمیاب ہی ہوتے ہیں (آمین ثم آمین) وسلام۔

امجد محمود (راولپنڈی)

Surah *Al-'Hujraat* الحجرات
Durus-al-Qur'an: Chapter 4

By G. A. Parwez
(Translated by: Mansoor Alam)

My dear friends, today is June 11, 1982 and our lecture starts with verse 14 of Surah *Al-'Hujraat* الحجرات (49:16). We will cover the last three verses of this Surah today.

In the last lecture we saw that أَعْرَابُ (*'Araab*) claimed that they have Iman. They were told that they didn't have Iman but that they have simply surrendered to the Islamic state; that Iman had not entered the depth of their heart. The practical proof that Iman has entered one's heart is shown by one's obedience to divine laws, not by reciting few words. The next verse is: قُلْ أَتُعَلِّمُونَ اللَّـهَ بِدِينِكُمْ وَاللَّـهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ وَاللَّـهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (49:16) – Tell them (the people who only talk and do not work accordingly): "Do you want to convince Allah just by talking that you are extremely obedient and firm in faith? Remember, Allah knows everything that exists in the heavens and on earth. He is well aware of everything."

There is no need for you to inform Allah that by reciting few words you have acquired Iman. Allah knows everything what you do.

My dear friends, these are very important verses. The Quran is not talking only to the أَعْرَابُ (*'Araab*) of those days. This applies to us as well. It applies to all places and all times. The Quran is forever until the Day of Judgment. It is us also that Allah is talking to: How can you say that you have Iman by reciting few words? How can you announce to the world using multimedia platforms and loudspeakers that you have become Momin; that you have become trustworthy and honest? We know everything – whether hidden or visible. Therefore, you do not need to inform Us. Then the Quran tells these أَعْرَابُ (*'Araab*): يَمُنُّونَ عَلَيْكَ أَنْ أَسْلَمُوا ۖ قُل لَّا تَمُنُّوا عَلَيَّ إِسْلَامَكُم ۖ بَلِ اللَّـهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ أَنْ هَدَاكُمْ لِلْإِيمَانِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (49:17) – O Messenger! These people talk as if they have done you a favor by accepting Islam. Tell them: "Do not claim any favor on me. In fact this is Allah's Grace upon you that He has guided you to Iman. Thus, if you are really serious and true in your claim, then you must express your gratitude to Allah, rather than claiming that you have done favor to me by accepting Islam."

First of all these أَعْرَابُ (*'Araab*) were wrongly claiming that they have Iman (because their actions were not in tune with divine laws). And, on top of it, they were claiming that they have done favor to you O Messenger! Tell them: you have not done any favor to me by accepting Islam.

Do you see my friends, how this behavior of أَعْرَابُ (*'Araab*) parallels our own

behavior today? Each party is after every vote they can get. Sometime a single vote makes or breaks the future success of a party. So, a member who joins a party claims the he has done favor to the party and its leaders. This is what those Bedouins were claiming. The Quran rebuffs them.

O Messenger! Tell them that Islam is not a party; that Islam is not a numbers game. If you join Islam then it does no benefit to Islam but you. In fact it is Allah's benevolence upon you that He has guided you to Iman. Thus, if you are really serious and true in your claim, then express gratitude to Allah for guiding you to Iman, rather than claiming that you have done favor to me by accepting Islam. Allah knows everything: إِنَّ اللَّـهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَاللَّـهُ بَصِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ (49:18) – Tell them that your saying so or reminders do not make any difference, for Allah knows the hidden realities and secrets of the entire universe. How can your deeds remain hidden from him? He sees all what you do. The result of every action is compiled according to Allah's Law of Requital.

There is no word in English or Urdu language that could express the meaning of مُنُّونَ. The root (م - ن - ن) of this word means receiving gift without any effort. The Quran has used this word for revelation, prophet-hood, and messenger-hood. The Quran says that this gift is not for any particular group or nation or for particular time but it is for entire humankind for eternity.

The Quran says: لَقَدْ مَنَّ اللَّـهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ (3:164) – Allah has been gracious indeed to the Momineen when He raised from amongst their own people a Messenger who communicates His Laws to them, purifies and develops their character and teaches them the Book and its objectives. Hitherto, they were in a state of rank ignorance.

What is divine revelation? Why was it given to humans? What would be the condition of humans if it wasn't given? It is extremely important to understand these thing. Then only it may be appreciated what is this vital invaluable grift that was given to humans by Allah through the Prophet (PBUH). And he was instructed by Allah: يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ (5:67) – O Messenger! Deliver to humanity what is being sent down to you. Deliver Allah's message to people. And tell them: يَا قَوْمِ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى الَّذِي فَطَرَنِي ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (11:51) – I ask for no return from you for the service which I am rendering to you. My recompense is with Him who has created me. Will you not reflect on what I say?

Similarity between animals and humans

My dear friends, why is this divine gift (of revelation) to humanity so important? This is extremely important point to think about. What is human being? Life started its evolutionary journey moving from one stage to the next until it reached it final stage of animal. When it moved ahead from the animal stage then it appeared in the form of humans. Therefore, there is a great similarity between human physical life and

animal life. Both follow similar physical patterns and laws. Scholars of this field of knowledge have found out through research three common attributes between animals and humans: 1) Self-preservation: to preserve one's life at all cost; 2) Self-defense: to defend oneself by force of power; and 3) Self-procreation: to advance one's generation through procreation.

Nature's control on animals

Nature has put full control on animal life and behavior. Once the stomach is full an animal does not care what happens to its meal. It feels contended until it feels hungry again. It does not hoard and amass. Animal procreation is also under nature's full control. Nature triggers animals into procreative mode and they procreate and nothing can stop them. They become obsessed with it. Once nature deactivates the procreative mode animals never engage in procreation until next time. Ghalib has put this beautifully:

Don't open the sack of the bud without blossom
When time is ready Nature will open it anyhow

So, animals will get the nod from Nature for it. Animal activity is under the full control of Nature. If a goat does not eat meat or if a lion does not eat grass it is because these are embedded in their nature. If a lion kills someone then the lion cannot be tried and charged with crime and punished for that. Animals do not have freewill and freedom of choice. Nature controls them. So, they are not accountable for their actions.

Humans have freewill as opposed to animals

When life reached the stage of humans then Nature lifted its control over human action. Allah granted them freewill and freedom of choice. Human actions therefore are not subject to the laws of nature. Only the human physical body is subject to physical laws. Otherwise, humans are completely independent and free to do whatever they choose. So, freedom of choice became the distinguishing hallmark of humans as compared to animals.

Imagine humans having physical needs similar to animals and Nature having lifted its control over them. Imagine humans being totally free to do whatever they choose but living among and interacting with other humans where each person fights for self-preservation without any limit or control of nature unlike animals, who, after their basic needs are met become satisfied and do not engage in hoarding and amassing more and more. But humans do not stop when their needs are met. Their greed drives them to keep on hoarding and amassing more and more. Their needs may be limited but their greed drives them for more and more – until they reach their grave. The Quran says: أَلْهَاكُمُ التَّكَاثُرُ ﴿١﴾ حَتَّىٰ زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (102:1-2) – Humans become oblivious of the real destination of humankind because of obsession for more, avarice and rivalry. Greed drives them to excel the other in amassing wealth and

acquiring more and more. If humans confine their demands to fulfilling only their own needs, then what is acquired would be limited. However when the motive is to excel over each other, then there can be no limit. In that case the more one acquires the greedier one becomes, till such time that one reaches one's grave.

To achieve his greed man devises ingenious techniques based on deception and intrigues to exploit others. This is the misuse of freewill that God has endowed humans. Animals do not descend to such malicious levels. They cannot cheat and deceive other animals. Whatever nature has programmed into their brains that is what they follow instinctively. But man has been granted intellect which gives him enormous power over the Universe. In search of treasure he is able to conquer the forces of nature and he is able to even coopt other planets. So much power has been given to man and there is no control over him from Nature; he has been endowed with freewill and free choice; and he has to live among other human beings. If that is the case then what can protect and preserve humankind and future generations from man's malevolent activity?

Left to itself human intellect creates hell on Earth

The West used human intellect to acquire mastery over the forces of nature. But the West used this enormous power to subdue and to exploit others. Others followed suit and the battle of wits became the standard operating procedure of nations turning the world into hell. As a consequence, the same battle of wits is occurring at the individual level. One who is more clever and cunning is able to deceive others; he is able to cheat others; he is able to exploit and take advantage of others. And the poor and weak suffer, and, as a result turn into vassals of the rich and cunning. This mental sickness spreads like a virus and corrupts the whole society.

My dear friends, if you read West's literature then you will find that this battle of wits has led to insecurity all over the West. They build latest killing machines but they remain constantly worried. Their capitalist system generates wealth but they have the greatest numbers of suicide and mental diseases. This is the result of battle of wits. This is the result of using intelligence for their own short term selfish gains. How sad that humans are the hunters of humankind!

Human intellect is neither good nor evil. It is like a sword or gun that can be used for good or evil. If it is used to terrorize or kill innocent humans then this is evil. If it is used to kill a tyrant that will save innocent lives then is it is good. So, who is going to tell: use intelligence for good and not of evil? And, who will listen? Intelligence knows only self-preservation and its own benefits. Joad put it beautifully when he said: "A man's thought follows his desire much as the feet of a hungry dog follow his nose." This is a very apt metaphor to describe human activity. Human intellect is an extremely valuable tool. The question is how to use it?

Iqbal has explained it very well. He says:

In the world of good and evil man finds himself confused and helpless

He cannot understand what is beneficial or what is harmful for himself
No one can figure out what action is decent and what action is indecent
Which is a stable and smooth path and which path is unstable and rough

It is our daily experience what Iqbal says here. We think and ponder and consult others and decide matters using our intellect but we soon find out that our decision was disastrous. Sometimes it happens that the decision was beneficial for myself but turned out to be harmful to others.

Iqbal says that, left alone, intellect always seeks its own benefit, thinks for its own benefit, works for its own benefit. Iqbal calls this self-seeing intellect. He says:

Self-seeing intellect is unmindful and heedless of other's benefit
It sees only its own benefit but doesn't care about other's benefit

Everyone sees one's own benefit. Those who don't, are labelled insane. Intellect is only used for one's benefit, or in the larger context for one's own nation. Those who are clever outsmart others, fool others, deceive others, and take advantage of others. Iqbal has put this succinctly when says:

Intellect is cunning which dons many forms
Love is neither priest nor righteous nor wise

My dear friends, the English word "reason" more appropriately captures the meaning of Arabic word عقل (*'Aql*). The word "reason" as defined by Western philosophers is: to see things as they really are. So, one should not don one's own intellectual color goggles to interpret things. Things should be looked at as they really are.

The Quranic standard for using عقل (*'Aql*)

My dear friends, the Quran provides the proper guidance for using عقل (*'Aql*). It says it should not be used for self-benefit nor for a nation's benefit but that that it should be used for humanity's benefit because: وَأَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ (13:17) – that which is of benefit to humanity only that abides on earth.

Now, how to decide what is beneficial to humanity. The Quran says that this is beyond عقل (*'Aql*) to decide this. Even if the entire world tries, it cannot decide what is beneficial to humanity. One's عقل (*'Aql*) left alone turns into cunning and clever manipulator in order to achieve one's own short-term benefit. The definition of "reason" – to see things as they are – requires that emotion must be kept out of it.

Only divine revelation is completely free from emotion

There is no way humans will be able to keep their emotions or desires out of decision making. Since Allah is beyond emotion, His revelation is objective and is not colored by any emotion: وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ (53:3) – Whatever he tells you in his capacity as a Messenger, he does not say it on his own. He only narrates the Revelation revealed to him from the Almighty. The Quran contains Divine revelation and the feelings or

personal opinion of the Messenger have no share in it. Human emotions and opinions are a result of personality and reflect a person's exposure in society. However the Revelation that one gets from divine source is unchangeable and cannot be affected by any of these.

The divine revelation keeps the entire humanity's benefit in front of it. It is independent of space and time restrictions because it comes from an infinite source. Therefore, it is a permanent value and a standard and guidance for all humanity for all time. Its guiding light will illuminate the path of humanity so that it can travel safely to its final destination. This is a great gift given to humanity by Allah. لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ (3:164) – Allah has indeed been extremely gracious to the believers by sending His Revelation which helps propel humanity from darkness to light.

As Iqbal says:

Self-seeing intellect is unmindful of other's benefit
It sees its own benefit and doesn't care about others'
Divine revelation sees the benefit of all of humanity
It keeps its eyes focused on the benefit and growth of all

Therefore, it is not possible for anyone or any group to decide what will be the course that will benefit the entire humanity except divine revelation.

Human condition without revelation

Just think about it my friends! Humans possessing this enormous power of intellect without any control whatsoever. Humans possessing animal instinct of self-preservation, self-aggression/self-defense, self-procreation but no control over them by Nature. Living together and interacting with one another and free to potentially exploit one another. Imagine individuals or nations, each trying to surpass the other; each fighting for one's own self-interests and using the power by conquering nature to subdue each other. Possessing ICBMs and threatening to annihilate other nations if they don't accept their hegemony and servility. So, what would become the condition of the world from such human behavior? Well, exactly as it has happened. Humans have turned the world into hell.

My dear friends, do you see what a great gift to humanity it is to receive revelation from Allah? This is purely from the Grace of Allah. But He only gave it but did not force humans to follow it. He left to their freewill whether or not to follow it. Freewill is the essence of human dignity. If Allah forced humans to follow it then there would be no difference between humans and animals.

Allah sees that tyrants have turned the world into hell. It is not at all difficult for him to squeeze them to death. He does not do that because He does not want to directly usurp the freewill and freedom of choice of any human. He sent His guidance and He wants them to follow it by their own freewill and choice. This is a law and He does not violate His laws.

4- وہ دائرہ اسلام سے باہر چوٹی کے حکماء اور فُضلاء کو ذہن میں رکھیں کیونکہ یہی لوگ ہیں جن کے قائل ہونے سے دنیا کی ذہنی فضا سے باطل تصورات کا اثر زائل کیا جا سکتا ہے۔

5- وہ علمی دنیا کے مسلمہ حقائق سے آغاز کر کے ان قرآنی حقائق کی طرف آئیں جن کی صحت لوگوں کے نزدیک مسلم نہیں۔

6- کسی غلط عقیدہ کی محض نفی مخالفین کو قائل نہیں کر سکتی جب تک اس کے مقابل کے صحیح تصور کا اثبات نہ کیا جائے۔

7- وہ ایک فلسفہ یا ایک فلسفیانہ خیال کی تردید کے لئے جن تصورات کو صحیح سمجھ کر کام میں لائیں تو کسی دوسرے فلسفہ یا فلسفیانہ خیال کی تردید کرتے ہوئے اسے غلط قرار نہ دیں۔ بلکہ اپنے موقف پر قائم رہیں۔

8- مغرب کے صحیح تصورات کو نہ تو رد کریں اور نہ ہی ان کے غلط تصورات کو قبول کریں۔

9- ہر غلط فلسفہ کے اندر وہ جن تصورات کو صحیح سمجھیں انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے غلط قرار نہ دیں اور جن تصورات کو غلط سمجھیں، انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے صحیح قرار نہ دیں ورنہ وہ اپنی تردید خود کریں گے۔

(3) ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کا موقف:

1- کسی علمی صداقت کے ساتھ متصادم نہ ہو بلکہ ہر زمانہ میں تمام علمی صداقتوں کے ساتھ پوری طرح سے ہم نوا اور ہم آہنگ رہے اور جوں جوں علمی صداقتیں منکشف ہوں وہ اس کے اندر سماتی چلی جائیں۔

2- جس کے تمام تصورات ایک دوسرے کے ساتھ عقلی ربط وضبط رکھتے ہوں اور ایک دوسرے کی عقلی تائید اور توثیق کرتے ہوں۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے جب اس کے تمام تصورات قرآن کے بنیادی تصور کے ساتھ عقلی طور پر متعلق ہوں۔

3- جو تمام باطل فلسفوں کی موثر تردید کرتی ہو۔

4- جو کائنات کا ایک مکمل فلسفہ ہو اور حقیقتِ انسان و کائنات کے اہم مسائل کے بارے میں عملی راہ نمائی کرتی اور صداقت اور سچائی کا راستہ بتاتی ہو۔

5- جو علمی تصورات کی خامیوں کو آشکار کر کے انہیں پاکیزہ اور سُستہ بناتی ہو۔

6- جو ہمیں احکامِ دین کی حکمتوں اور علتوں کے پورے سلسلہ سے آگاہ کرتی ہو اور ان حکمتوں اور علتوں کا ایک ایسا تصور دیتی ہو، جس میں اندرونی طور پر کوئی تضاد نہ ہو۔

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL.73
ISSUE
10

Monthly
TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com
Web:www.toluislam.com www.facebook.com/talueislam/

مفہومِ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خدائے رحمٰن ورحیم نے اس کتابِ عظیم کو اس لئے نازل کیا ہے کہ اُس نے، اشیائے کائنات اور نوعِ انسان کی نشوونما کی جو ذمہ داری لے رکھی ہے، وہ پوری ہوجائے۔(6:54؛6:12)

یہ نشوونما، وحی کی راہنمائی کے بغیر ممکن نہیں۔(17:82؛10:57۔58)

چونکہ انسانی دنیا میں خدا کی ذمہ داریاں انسانوں کے ہاتھوں پوری ہوتی ہیں، اس لئے خدا کے بندوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ جس کام کا بھی ارادہ کریں اُس سے مقصد، خدا کے اِس پروگرام کی تکمیل ہو۔(6:163)